اب تک تھی کہاں
ابنِ صفی
60.00

اب تک تھی کہاں

ابنِ صفی

اسرار پبلی کیشنز
الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ
اردو بازار لاہور فون، 7357022-7321970

اس ناول کے نام، مقام، کردار اور کہانی سے
تعلق رکھنے والے اداروں کے نام فرضی ہیں۔

پبلیشر............خالد سلطان
پرنٹر............یمانی پریس

سیل ڈپو: عثمان ٹریڈرز
الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ
اردو بازار لاہور۔ فون۔ 7357022-7321970

پیشرس

یہ کہانی کراچی کے بلند پایہ ماہنامے
"عالمی ڈائجسٹ" میں بالاقساط شائع
ہو چکی ہے۔ خواجہ نجم الدین نجمی کی
روداد ہے، جسے میں نے اپنے الفاظ
میں بیان کیا ہے۔

خود آدمی کا ذہن کتنا پُراسرار ہے؟
کیسی کیسی کیفیّات سے گزرتا ہے۔

کن کن ادوار کی پرچھائیاں اس میں
رینگتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے
ذہنوں کو وہ کس طرح اپنی طرف متوجہ
کرتا ہے۔ یہ کہانی ایسے ہی سوالات
پر مشتمل ہے۔

مصری اساطیر کی فضا میں یہ کہانی
پروان چڑھتی ہے اور اختتام بیسویں
صدی پر ہوتا ہے۔ اس میں سسپنس
بھی ہے۔ رومان بھی ہے اور ڈراما
بھی۔۔۔! آپ یہی محسوس کریں گے
جیسے کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔

ابن صفی
۱۴
۳
۷۴

نیا پڑوسی عجیب تھا۔ بچے دن بھر اس کے پائیں باغ کے درختوں
پر پتھر چلاتے رہتے لیکن اس کے کانوں پر جوں نہ رینگتی۔

اس سے پہلے اس عمارت میں جو خاندان آباد تھا، اُس کے افراد کا جھگڑالو
پن بھی ضرب المثل بن کر رہ گیا تھا۔ وہ آموں کی فصل پر اپنی چہار دیواری کے قریب
کسی بچے کا وجود برداشت ہی نہ کر سکتے تھے۔

اور ان کے آم ہوتے تھے کہ قیامت۔ انہیں شاخوں میں جھولتے دیکھ
کر طبیعت بے قابو ہو جاتی تھی۔ بڑے بڑے گول مٹول آم جن کے اوپری
حصّوں پر سونے کی سی رنگت جھلکیاں مارا کرتی۔

کئی بار اندھیرے اُجالے میں میں نے بھی ان پر پتھر چلائے تھے اور
میں اس وقت بچہ نہ تھا۔ انٹر میڈیٹ کے دوسرے سال کا طالب علم تھا۔

ایک دن آموں کی بھری فصل میں اطلاع ملی کہ وہ خاندان اس عمارت کو فروخت
کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سن کر ذہن کو جھٹکا لگا۔ کیونکہ اس خاندان میں ایک
خاتون ایسی بھی تھیں، جن کا چہرہ ہر صبح برکت کے لئے دیکھنا میری ہابی تھی۔
جس صبح وہ دکھائی نہ دیتیں پورا دن نحوستوں کی نذر ہو جاتا۔
عمارت فروخت ہو گئی۔ بس سن لیا تھا۔ خریدار کے بارے میں کچھ
معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔
ان دنوں اپنا خیال تھا کہ سب سے اچھا پڑوسی وہی ہے، جو دوسرے پڑوسیوں
سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ صاحب سلامت ہو گئی تو کبھی نہ کبھی جوتم پیزار
کی نوبت بھی آجائے گی۔ لہٰذا ؎

بے نیازانہ دنیا سے گزر

لیکن یہ دوسرا پڑوسی سخت بے حس قسم کا آدمی تھا۔ نوٹس ہی نہ لیتا
تھا بچوں کا ۔ ۔ ۔ خواہ وہ آموں کے درختوں پر پتھر چلائیں خواہ وہ چہار دیواری
پر چڑھ کر درختوں پہ جا پہنچیں، اس بری طرح باغ اجاڑا جا رہا تھا کہ خدا
کی پناہ ۔ ۔ !
کسی نے آج تک پڑوسی کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ کبھی کبھی رات
گئے ایک لمبی سی سیاہ گاڑی پائیں باغ کے پھاٹک سے نکلتی اور باہر
پھیلے ہوئے اندھیروں میں گم ہو جاتی اور پھاٹک کھلا ہی پڑا رہتا۔
کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس عمارت میں اب کتنے افراد رہتے ہیں، لوگوں
میں چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ سب ہی اس پڑوسی کے بارے میں جاننا

چاہتے تھے کہ وہ کون ہے ـــــــ لیکن پتہ نہیں کیوں کسی نے ابھی
تک اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
میں اپنے چھوٹے بھائی کو بھی اکثر درختوں پر پتھر چلاتے دیکھتا اور
اُسے اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتا۔
ایک دوپہر جب گرمی شباب پر تھی۔ میں بیٹھک میں پڑا اونگھ رہا
تھا۔ دفعتاً کسی نے باہر سے دروازہ تھپتھپایا۔ اٹھ کر باہر نکلا۔ لیکن وہ
آدمی میرے لئے اجنبی تھا۔
"میں نجمی صاحب سے ملنا چاہتا تھا۔" اُس نے بڑی شائستگی
سے کہا۔
"میں ہی ہوں۔ فرمایئے ۔ ؟"
اس کے ہونٹوں پر بڑی دلآویز سی مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ پرکشش
شخصیت کا مالک تھا۔ پہلی ہی نظر میں اس کے بارے میں بہت اچھی
رائے قائم کی جا سکتی تھی۔ عمر زیادہ سے زیادہ تیس سال رہی ہوگی۔
"میں آپ کا پڑوسی ہوں۔" اس نے اپنے مکان کی طرف اشارہ
کر کے کہا۔
"اوہ ـــ بڑی خوشی ہوئی۔"
میں نے اُس سے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا تھا اور عجیب سی خوشی
محسوس ہوئی تھی۔ یہ معلوم کر کے کہ یہی ہمارا پُراسرار پڑوسی ہے۔ وہ تو سراپا
اخلاص معلوم ہوتا تھا۔

"آپ کو تھوڑی سی تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ ذرا غریب خانے تک چلئے۔" اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"ضرور۔ ضرور۔ جناب" میں اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔

یہ سب کچھ غیر متوقع طور پر ہوا تھا۔ اس لئے میرے اعصاب پر اضطراب سا طاری ہوگیا تھا اور اسی اضطراب کے تحت میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

لیکن پائیں باغ کے پھاٹک میں قدم رکھتے ہی ایک انجانے خوف کی سی لہر ذہن میں دوڑ گئی۔ میں نے کنکھیوں سے اجنبی کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے میرے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر طمانیت تھی۔ یہ تو وہی تھا . . . وہی پر اسرار آدمی جس نے یہ عمارت خریدی تھی۔ وہی جس کے بارے میں اکثر میں نے سوچا تھا کہ کہیں وہ کوئی بہت بڑا مجرم نہ ہو۔

اس عمارت میں میرا داخلہ ایک سنسنی خیز تجربہ تھا۔

وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

"میرے خدا"

جیسے ہی میری نظر سامنے والے صوفے پر پڑی۔ مجھے ایسا محسوس جیسے کسی نے بلندی سے نیچے پھینک دیا ہو۔

میرا چھوٹا بھائی اسد صوفے پر آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔

"اسے کیا ہوا۔۔؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

اسد کا سر اور چہرے کا کچھ حصہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

"درخت پر چڑھے تھے۔ گر گئے۔ لیکن آپ مطمئن رہیئے۔ میں نے میڈیکل چیک اپ کرالیا ہے۔ کوئی ہڈی وغیرہ نہیں ٹوٹی۔ سر کی کھال ایک آدھ جگہ سے پھٹ گئی ہے"

میں نے اسد کو گھور کر دیکھا۔

"نہیں جناب۔ آپ اسے اس طرح نہیں گھوریں گے"۔ وہ مسکرا کر بولا "میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اسے گھر والوں کے عتاب سے بچاؤں گا۔ اسی لئے آپ کو یہاں لایا ہوں"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں" میں زبردستی مسکرایا۔

"بچے ہیں" وہ پر تفکر انداز میں بولا "میں بھی بچپن میں پھل دار درختوں پر پتھر چلایا کرتا تھا"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

"اوہ بیٹھئے . . . آپ کھڑے کیوں ہیں" اس نے کچھ دیر بعد کہا اور میں اس کا شکریہ ادا کرکے بیٹھ گیا۔ اسد کے برابر صوفے پر۔ اس نے اپنے پیر سکوڑ لئے تھے۔

ڈرائنگ روم کی فضا مسحور کن تھی۔ دیواروں پر بہت ہی اعلیٰ درجے کی مصوری کے نمونے آویزاں تھے اور ان سب سے کچھ عجیب قسم کی ترنگ وابستہ محسوس ہوتی تھی۔

"آپ وعدہ کیجئے" وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولا "انہیں گھر والے اس سلسلے میں بور نہیں کریں گے"

میں کچھ نہ بولا۔ میری نگاہ ان دو آنکھوں پر ٹھہر گئی تھی۔ صرف دو آنکھیں

تھیں۔ ایک بڑے سے فریم میں جو دوسری پینٹنگز کے درمیان آویزاں تھا۔
آنکھیں۔ ایسی آنکھیں آج تک میری نظر سے نہیں گزری تھیں۔ ذرا سی دیر میں مجھے
گردوپیش کا ہوش نہ رہا۔ بس وہ آنکھیں تھیں اور میرا ذہن۔۔۔ ایسا محسوس ہوتا تھا
جیسے زمان و مکان ان دونوں آنکھوں میں سمٹ آئے ہوں۔۔۔ اور میں ایک حقیر تنکے
کی طرح ان بیکراں وسعتوں میں اڑا جا رہا ہوں۔ پھر ایسے لگا جیسے میرے اور ان
کے درمیان کہر سی چھا گئی ہو۔ لطیف سی کہر جس سے وہ اب بھی نمایاں تھیں اور
مجھے پہلے ہی کی طرح گھورے جا رہی تھیں۔

"کیا بات ہے ۔ ؟" دفعتاً کوئی میرے کانوں کے قریب چیخا اور میں نے اپنی
کلائیوں پر کسی کی گرفت محسوس کی۔

خداوندا۔ میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔

پُراسرار پڑوسی میری کلائیاں پکڑے کوشاں تھا کہ میں اپنے چہرے سے
ہاتھ ہٹاؤں۔

"کیا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ ؟" اس کے لہجے میں اضطراب تھا!
میں اس ذہنی انتشار کے عالم میں بھی یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے
مضطربانہ لہجے میں کسی قسم کی مسرت کا عنصر شامل تھا۔

"م۔ میں۔۔۔ بالکل ٹھیک ہوں۔"

"یک بیک کیا ہو گیا تھا آپ کو۔ ؟"

میں نے پھر ان آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر محسوس ہوا جیسے سارا جسم
جھنجھنا کر رہ گیا ہو۔ اب میں نے تہیہ کر لیا کہ ان آنکھوں کی طرف دیکھوں گا ہی نہیں

"کیا آپ کو میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ۔ ؟"

"نہیں جناب۔ قطعی نہیں۔ آپ تو بہت اچھے آدمی ہیں۔"

اس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ پھر اسد کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
وہ بھی شاید میری وجہ سے پریشان ہو گیا تھا۔

میں نے اُس کا بازو تھپک کر کہا "تم فکر نہ کرو تمہیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اتنے میں ایک عجیب وضع کا آدمی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اس کا سر اور
چہرہ بالکل صاف تھا۔ حد یہ ہے کہ بھنویں تک غائب تھیں۔ جسم پر سرمئی رنگ کا ڈھیلا
ڈھالا لبادہ تھا۔ آنکھیں چھوٹی اور بیحد روشن تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی عمر پچاس
سے کسی طرح کم نہ ہوگی لیکن چہرے پر جوانوں کی سی تازگی تھی۔

یقیناً وہ عربی زبان ہی تھی جس میں میرے پڑوسی نے اُسے مخاطب کیا تھا
اس کی بات سُن کر وہ چلا گیا اور پڑوسی نے مجھ سے کہا۔

"میں آپ کی خدمت میں ایک مصری مشروب پیش کروں گا۔"

"مشروب۔ ؟" میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ "مشروب" کیا چیز ہو سکتی ہے۔
جملے کی بناوٹ بھی اس کا صحیح مفہوم مجھ پر واضح نہ کر سکی۔ انٹرمیڈیٹ کے
دوسرے سال کا طالب علم ضرور تھا لیکن میری اُردو اتنی "گاڑھی" نہیں تھی۔

"آپ کہیں پڑھتے ہیں۔ ؟" اُس نے کچھ دیر بعد مجھ سے سوال کیا۔

میں اسے اپنی تعلیمی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہا۔ اتنے میں وہی
آدمی ہاتھوں پر ایک ٹرے اٹھائے ہوئے اندر آیا۔ تین عجیب وضع کے پیالے ٹرے میں

موجود تھے۔ ایسے پیالے میں نے مصر کی قدیم کہانیوں سے تعلق رکھنے والی فلموں میں دیکھے تھے۔

عجیب قسم کی سنسنی میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔

اس نے ٹرے میز پر رکھ دی اور ایک ایک پیالہ اٹھا کر ہمیں پیش کرتا رہا۔ پڑوسی نے پیالے کو بالکل اسی انداز میں دونوں ہاتھوں سے پکڑا تھا جیسے میں فلموں میں دیکھ چکا تھا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ لفظ "مشروب" میں صد فی صد شربت کو دخل ہے۔

اسد بھی اٹھ بیٹھا تھا اور مزے لے لے کر اس خوش ذائقہ مشروب سے فیضیاب ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ ڈھیٹ کہیں کا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس شریف آدمی کا باغ اجاڑتا رہا اور اب ...

"کیسے پسند آیا۔؟" پڑوسی کی مسکراہٹ بڑی دلآویز تھی۔

"تعریف کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ بہت لذیذ شربت ہے۔"

اتنے میں اسد نے پیالہ خالی کر کے اس عجیب الخلقت ملازم کی طرف بڑھایا اور وہ یک بیک نہ معلوم کس زبان میں بڑبڑانے لگا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں اور وہ بہت زیادہ غصّے میں معلوم ہو رہا تھا۔

"میاں! پیالے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُسے دو۔" دفعتاً پڑوسی بول اٹھا۔

اسد نے پیالے میں دوسرا ہاتھ بھی لگا دیا۔ تب اُس آدمی نے پیالہ

اُس سے لے کر ٹرے میں رکھتے ہوئے پڑوسی سے کچھ کہا۔

پڑوسی پہلے تو ہنسا تھا۔ پھر تیز لہجے میں اس سے کچھ کہنے لگا تھا۔ وہ بُرا سا منہ بناتے۔ ٹرے اٹھاتے ہوئے باہر چلا گیا۔ پڑوسی میری طرف مڑا اور مسکرا کر بولا۔

"یہ آدمی مصر کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔!"

"کچھ ڈراؤنا سا لگتا ہے۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں، وہ میرا ملازم ہے۔"

"آخر خفا کس بات پر ہوا تھا۔؟"

"یہ مقدّس پیالے تھے۔ انہیں ایک ہاتھ سے پکڑنا اس کی دانست میں ان کی تضحیک ہے۔ توہین ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔ پیالے بھی مقدّس ہونے لگے۔"

اس نے بڑے غور سے میری آنکھوں میں دیکھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سارے جسم میں برقی رو سی دوڑ گئی ہو، جیسے ہی میں نے اس سے آنکھیں چرائیں، وہ بول پڑا۔

"نجمی صاحب! اب سے ہزاروں سال پہلے کی دُنیا کا تصوّر کیجیے۔"

"جی ہاں! جی ہاں! یقیناً یہ پیالے مقدّس ہی ہوں گے۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"یہ پیالے مصر کے ایک قدیم ہیکل سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"ہیکل۔ کیا چیز۔؟" میں نے پوچھا۔

"ہیکل۔ مصریوں کی عبادت گاہ ہیکل کہلاتی تھی۔"

"اوہ۔ اچھا۔ لیکن یہ آپ کو کہاں سے مل گئے۔"

"مصر ہی سے ملے ہیں۔ مجھے نوادرات اکٹھا کرنے کا شوق ہے۔ کبھی فرصت سے آپ کو دکھاؤں گا اپنا کلکشن۔"

"مجھے بہت لگاؤ ہے پرانی چیزوں سے۔"

"اچھا۔!"

اس نے پھر میری آنکھوں میں دیکھا اور میں نظریں چرانے لگا۔ اُس کی نگاہوں میں بھی کوئی خاص بات تھی۔

اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر میں پھر دیوار کی تصاویر کا جائزہ لینے لگا اور جیسے ہی اُن دونوں آنکھوں پر نظر پڑی۔ بوکھلا کر پھر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"آپ انہیں گھر چھوڑ آیئے۔ کیا نام ہے ان کا۔؟"

"اسد" میں نے کہا۔

"اچھا نام ہے۔ ترقی کریں گے۔" اُس نے بزرگانہ انداز میں کہا۔

"تو پھر میں اسے چھوڑ آؤں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ جی چاہے تو پھر واپس آکر میرے عجائب خانے کی سیر کیجئے گا۔!"

میں اسد کو گھر لایا۔

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ اسد پر کیا گزری۔ پڑوسی کیا ہے؟ کون ہے؟ پہلے کہاں رہتا تھا۔ کیا کرتا ہے؟ کیا وہ بُرا آدمی معلوم ہوتا ہے؟

میں نے کہا اگر بُرا آدمی ہوتا تو اسد کو مزید دشواریوں سے بچانے کی کوشش کیوں کرتا۔

لیکن نہ جانے کیوں میں یہ کسی کو نہ بتا سکا کہ میں پھر اس عمارت میں واپس جا رہا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی غیبی آواز مجھے بار بار تنبیہہ کر رہی ہو کہ میں اس کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہوں۔

میں پھر بیٹھک میں واپس آگیا۔ دوبارہ جانے سے پہلے میں اپنی اس کیفیت کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا، جو ان دونوں آنکھوں کی پینٹنگ کی وجہ سے مجھ پر گزری تھی۔

کیا ہوگیا تھا مجھے۔ میں نے اپنا چہرہ کیوں ڈھانپ لیا تھا اور مجھے اس حال میں دیکھ کر پڑوسی کی آواز میں وُہ پُرمسرت ارتعاش کیوں پیدا ہوا تھا۔ بالکل ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اس کا کوئی تجربہ خاطر خواہ طور پر کامیاب ہوا ہو۔

پھر مجھے اس کا وہ پُراسرار مصری ملازم یاد آیا۔ اس کی شخصیت میں بھی کوئی عجیب سی بات تھی، اس کی آنکھیں بھی غیر معمولی تھیں۔ جب وہ کسی کی طرف دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے سامنے ایک عظیم خلا کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔ حالانکہ آنکھیں بے حد چمکیلی اور جاندار تھیں

پھر بھی ایسی دیر ان لگتی تھیں جیسے وہ گزری ہوئی صدیوں میں جھانک رہا ہو۔

کچھ دیر بعد کلاک نے تین بجائے اور میں چونک پڑا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اب وہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہاں اس کے ڈرائنگ روم میں مَیں نے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کیا تھا! لیکن اب دوبارہ جانے کی سوچ کر پتہ نہیں کیوں مجھے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

پھر کیا کیا جاتے؟ میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ اسد کو پہنچا کر واپس آجاؤں گا۔ اس نے وہ نوادرات اسی لئے تو اکٹھا کئے تھے کہ دوسرے انہیں دیکھیں اور دنگ رہ جائیں۔ اس کی تلاش و جستجو کی صلاحیتوں کو سراہیں۔ وہ مجھے اپنے نوادرات دکھانا چاہتا تھا۔ میرا فرض تھا کہ اس اچھے پڑوسی کی اس خواہش کا احترام کرتا۔ لیکن اس نے تو اپنا نام تک بتانے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ آخر کیا نام ہوگا، اس کا ــ؟

پھر نام ہی کے بارے میں ادھیڑ بن شروع ہوگئی۔ حتیٰ کہ کلاک نے چار بجائے، میں کمرے سے باہر نکلا۔

آج محلے کے کئی آدمیوں نے اُسے عمارت کے پھاٹک سے برآمد ہوتے اور مجھے تکتے دیکھا تھا! ظاہر ہے کہ انہوں نے مجھے اس کے ساتھ جاتے ہوتے بھی دیکھا ہوگا۔

وہ سب مجھ سے ملنے کے لئے بے چین تھے، جیسے ہی میں مکان سے برآمد ہوا وہ میری طرف بڑھے تھے۔ اسے جھپٹنا ہی کہا جا سکتا تھا۔ ہر شخص بھانت بھانت کے سوالوں سے حلق تک بھرا ہوا تھا۔

دفعتاً مجھے پھر محسوس ہوا کہ جیسے کوئی غیبی آواز مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں اپنے پڑوسی کے بارے میں اس سے زیادہ نہ بتاؤں کہ وہ ایک خوش اخلاق اور رحمدل آدمی ہے اور پھر اسد کی کہانی دوہرا دوں۔

میں نے یہی کہا ــ پتا نہیں کیوں اس سے زیادہ نہ کہہ کر میں نے عجیب قسم کی مسرت محسوس کی۔

یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ میں دوبارہ اس عمارت کے کمپاؤنڈ میں قدم نہ رکھ سکا۔

رات گئے تک گھر والوں میں پڑوسی کے تذکرے سنتا رہا۔ اسد تو اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”میں نے اتنا اچھا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ مجھے زخمی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ فرشتہ ہے فرشتہ۔“

شام ہی سے بادلوں کے پرے آسمان میں ڈیرے ڈالتے رہے تھے اور اس وقت تو ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔

کھلی چھت پر لیٹتے وقت میں نے سوچا کہیں سوتے سے اُٹھ کر

نہ جاگنا پڑے، لہٰذا نیچے کمرے ہی میں چلئے۔ بستر بغل میں دابا اور زینوں کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس عمارت کی روشن کھڑکیوں اور جالیوں پر نظر پڑی ۔ ۔ ۔ جہاں تھا وہیں رُک گیا۔

پتہ نہیں یہ میرا وہم تھا یا حقیقت — ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر روشن کھڑکی سے وہی دونوں آنکھیں جھانک رہی ہوں — !

میں طبعاً ڈرپوک نہیں تھا، پھر بھی میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی لیکن یہ اُن آنکھوں کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ ایک کھڑکی میں پر اسرار ملازم بھی نظر آیا تھا۔ اتنے فاصلے سے بھی وہ کتنا ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ اس کی چمکیلی آنکھیں اتنی دور سے بھی صاف اور واضح نظر آ رہی تھیں۔ فاصلے کا بھی تو کچھ اثر نہیں پڑا تھا اس پر۔ چہرے کی بناوٹ کی ایک ایک تفصیل واضح تھی۔

کیا ایسا ممکن ہے؟ ممکن ہو یا ناممکن۔ اس وقت تو ایک جیتی جاگتی حقیقت نظروں کے سامنے تھی۔

میں کئی منٹ تک وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا اور میرے قدم دوبارہ زینوں کی طرف بڑھنے لگے۔

مجھے بیٹھک ہی میں سونا تھا۔ سڑک کے رُخ والی کھڑکیاں کھول کر میں لیٹ گیا لیکن کمرے میں روشنی نہیں کی۔ سامنے والی عمارت کا کچھ حصّہ کھڑکیوں سے بھی دکھائی دیتا تھا۔

کلاک نے ایک بجایا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

ایک بار جھنجلا کر اٹھا اور کھڑکی کے قریب آ کر باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑنے لگا۔

یہاں سے عمارت کا کوئی روشن حصّہ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ بیچ میں چہار دیواری حائل ہو گئی تھی۔

میں پھر بستر کی طرف پلٹ آیا، لیکن اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا! بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کسی نے میرا ہاتھ پکڑا ہو اور بستر تک نہ صرف کھینچ لایا ہو، بلکہ زبردستی لٹا بھی دیا ہو۔

سارے جسم میں عجیب قسم کی سنسنی دوڑ گئی۔ لیکن یہ خوف تو نہیں تھا! میں نے اچھی طرح اپنے ذہن کو ٹٹولا۔ میں ہرگز خائف نہیں تھا۔ اس کے برخلاف میں ایک طرح کی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔

میں نے اپنی کلائی کو ٹٹولا۔ اب بھی اس پر اسی قسم کا تاثر محسوس ہوا جیسے کچھ دیر پہلے کسی کی گرفت میں رہی ہو۔

خدایا — ! یہ سب کیا ہے۔ میں نے سوچا اور میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی چلی گئیں — !

. . . . . .

دوسری صبح بیدار ہوا تو ذہن کی عجیب سی حالت تھی۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ اپنے گھر والے اجنبی سے لگ رہے تھے۔۔۔ پچھلی رات نہ جانے کتنے اور کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔ ایک بھی یاد نہیں تھا ان میں سے، لیکن عجیب سا تاثر تھا ذہن پر، جیسے کچھ دیکھا تھا۔۔۔ کوئی بہت ہی خاص چیز۔۔۔ اور وہ چیز شعور کے گوشوں کو چھوتی ہوئی پھر اندھیروں میں گم ہو جاتی۔۔۔ ایک عجیب سی خوشگوار الجھن تھی۔۔۔

آخر ایک بزرگ نے ناشتے کی میز پر ٹوکا "تم آج کچھ کھوئے کھوئے سے ہو!"

"جی ہاں۔" میں نے چونک کر جواب دیا "پچھلی رات خواب

دیکھا تھا، جیسے رزلٹ آگیا ہو۔ اور میں تیسری پوزیشن میں کامیاب ہوا ہوں۔"

"خواب وخیال ہے۔" انہوں نے لاپرواہی سے سر جھٹک کر کہا۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔"

پھر خوابوں کے متعلق بحث چھڑ گئی تھی۔ میں ان کی آوازیں ضرور سُن رہا تھا لیکن گفتگو کا مفہوم ذہن نشین نہیں ہو رہا تھا! مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی ان کی بحثوں سے ذہن پہ ایک غبار سا طاری تھا۔ ہر قسم کا احساس کچھ دھندلا سا گیا تھا، حد یہ ہے کہ لوگوں کے چہرے تک صاف نظر نہیں آتے تھے۔۔۔! ناشتے کے بعد اچانک خیال آیا کہ مجھے اس عمارت میں جانا چاہیے اور پھر یہ خیال ایک قسم کے نشے کی طرح میرے اعصاب پر مسلط ہوتا چلا گیا۔۔۔

ساتھ ہی نہ جانے کیوں میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے وہاں جاتا دیکھ سکے!۔۔۔

تھوڑی دیر بعد مجھے موقع مل گیا! کال بیل کا بٹن دباتے ہی مصری ملازم نے اس طرح دروازہ کھول کر اپنا شفاف چہرہ باہر نکالا جیسے وہ گھنٹی کے بٹن ہی سے منسلک رہا ہو۔

پھر پورا دروازہ کھلتا چلا گیا۔۔۔ اور میں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے مصری ملازم سے کہا کہ میں اس کے مالک سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔

اس نے اپنے سر کو جنبش دی اور مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھا کر

چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد پُراسرار پڑوسی کی شکل دکھائی دی . . . آج بھی کل ہی کی سی شگفتہ اور پُرخلوص مُسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اس نے اس طرح میرا استقبال کیا، جیسے میں کوئی معمر اور معزز آدمی ہوں۔

"نجمی صاحب ۔۔! میں آپ کا منتظر تھا . . . آپ نے وعدہ کیا تھا ناکہ میرے نوادرات دیکھیں گے . . . !"

"یہاں تو مجھے ہر جگہ نوادرات ہی نظر آتے ہیں . . ." میں نے دیواروں کی تصاویر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا اور جیسے ہی ان دو آنکھوں کے مقابل میری آنکھیں ہوئیں جسم جھنجھنا اُٹھا۔ پھر اب کہاں اتنی سکت تھی۔ آنکھوں میں کہ وہ وہاں سے ہٹ جائیں۔

"اوہ . . ." دفعتاً پڑوسی بولا "کل بھی آپ دیر تک اس تصویر کو دیکھتے رہے تھے"

"جی ہاں . . . !" میں چونک پڑا۔

"کیا اس میں کوئی خاص بات نظر آتی ہے آپ کو ؟"

"بہت زیادہ . . . لیکن میں اپنے خیالات کو الفاظ بخشنے کا سلیقہ نہیں رکھتا"

"آج تک کسی نے بھی اس تصویر میں اتنی دلچسپی نہیں لی جتنی آپ لے رہے ہیں"

"تو پھر آپ نے اُسے ان تصویروں میں کیوں جگہ دی ہے ۔ ؟"

"بس یونہی . . . ! یہ ساری تصاویر میری ہی بنائی ہوئی ہیں . . !"

"آپ ایک باکمال مصوّر ہیں !"

"لیکن مشہور نہیں . . . آپ نے کبھی میرا نام نہ سنا ہوگا . . !"

"مجھے اپنی اس محرومی پر افسوس ہے کہ میں آپ کے نام سے واقف نہیں !"

"میرا نام ابوالفرحان ہے"

"مجھے مصوّری سے دلچسپی ہے۔ بے شک یہ نام میں نے پہلے کبھی نہیں سُنا !"

"خیر چھوڑیئے . . . مجھے بتانے کی کوشش کیجئے ۔ کہ ان آنکھوں کو دیکھ کر آپ کیا محسوس کرتے ہیں . . . لیکن ٹھہریئے میں نے ابھی تک آپ کا پسندیدہ مشروب نہیں پیش کیا۔

اُس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کی آواز کی گونج بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ وہ کمرے میں موجود تھا۔ ابوالفرحان نے اس سے عربی میں کچھ کہا اور وہ چپ چاپ واپس چلا گیا۔

"آپ کو شاید میرا یہ ملازم پسند نہیں !"

"کچھ ڈراؤنا سا ہے ۔"

"بالکل نہیں . . . اچھا آپ یوں کیجئے ! جب وہ مشروب پلائے تو آپ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر پیالہ دونوں ہاتھوں سے

تھامیتے گا۔ !"

"اس سے کیا ہوگا۔؟"

"اس کے خلاف آپ کی شکایت رفع ہو جائے گی۔" اُس نے کہا اور پھر ان دو آنکھوں کی تصویر پر نظر جما دی۔

"ہاں ... آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ اس نے تصویر سے نظر ہٹائے بغیر پوچھا۔ !

"سب سے پہلے تو یہ کچھ جانی پہچانی لگتی ہے ... !"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"اور ... !"

"ایک دھندسی میری آنکھوں کے سامنے چھا جاتی ہے ... لیکن یہ آنکھیں اس کے باوجود بھی مجھے صاف نظر آتی ہیں اور ذہن کی کیفیت کیا بتاؤں ... ایسا لگتا ہے ... ایسا لگتا ہے ... بس یہ سمجھ لیجئے، جیسے کوئی بھولا ہوا خواب یاد آتے آتے رہ جائے۔ !"

وہ کرسی سے اُٹھ گیا۔ دبا دبا سا جوش اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک ٹک مجھے دیکھتے ہوئے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"اور ... ؟"

"میں سوچ کر ہی بتا سکتا ہوں ... اظہارِ خیال کے لئے

مجھے الفاظ نہیں ملتے ... اکہیئے تو لکھنے کی کوشش کروں !"

"ضرور ... نجمی صاحب ... ضرور !" وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتا ہوا بولا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کونسی بات ... ؟"

"آخر آپ میری رائے کو اتنی وقعت کیوں دیتے ہیں جب کہ میں صرف ایک ناتجربہ کار طالب علم ہوں۔"

"یہ میں پھر بتاؤں گا۔ !"

اتنے میں مصری ملازم مشروب کی کشتی سنبھالے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔

جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا حسب ہدایت میں نے فرش پر داہنا گھٹنا ٹیک کر دونوں ہاتھوں سے پیالہ لے لیا۔

اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی ... وہ اظہارِ مسرت ہی تھا ... پھر جب میں مشروب پی کر پیالہ واپس کرنے لگا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس نے جھک کر میری پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔ اور ... وہ خوشبو ... خدا کی پناہ ... پتہ نہیں کہاں سے آئی تھی۔ ذہن پر اس خوشبو کی یلغار کا عجب تاثر تھا۔ میں جہاں تک وہیں کھڑا رہ گیا ... ذہن میں آندھیاں سی اُٹھ رہی تھیں ... میری نظر پھر ان دونوں آنکھوں کی طرف اُٹھ گئی ... اور میرا سر چکرا کر رہ گیا! ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان آنکھوں کے گرد ایک چہرہ تشکیل پا رہا

ہو۔ وہ ایک مکمل چہرہ تھا۔ ۔ ۔ کسی فلمی کلوزاپ کی طرح پل بھر کے لئے چمکا اور پھر نظر سے اوجھل ہو گیا۔

میرا پورا جسم بُری طرح کانپ رہا تھا۔ ۔ ۔ اور آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ ۔ ۔ !

اس کیفیت کی ابتدا سے دوبارہ آنکھ کھلنے تک کا وقفہ میرے لئے ہمیشہ تاریک ہی رہا۔ ۔ ۔ میں صوفے پر لیٹا ہوا تھا اور ابوالفرحان اسطرح مجھ پر جھکا ہوا تھا جیسے میری سانسیں گن رہا ہو۔ ۔ ۔ ! میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ۔ ۔ لیکن اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر لیٹے رہنے کو کہا۔

میری نظر اس کے چہرے سے ہٹ کر مصری ملازم پر پڑی۔ ۔ ۔ وہ سرتاپا عجز و نیاز بنا کھڑا تھا جیسے ہی اس سے نظر ملی، سینے پر ہاتھ رکھ کر اس طرح جھکتا چلا گیا جیسے مجھے تعظیم دے رہا ہو۔ ۔ ۔ !

"یہ سب کیا ہے۔ ۔ ۔ جناب!" میں نے کمزور سی آواز میں اپنے پڑوسی سے پوچھا۔

"آپ کچھ دیر آرام کیجئے نجمی صاحب! آپ بے ہوش ہو گئے تھے۔ کیا پہلے بھی کبھی آپ پر اس قسم کا دورہ پڑ چکا ہے!"

"جی نہیں۔ ۔ ۔ کبھی نہیں۔ ۔ ۔"

پھر میری نقاہت حیرت انگیز طور پر بتدریج ختم ہوتی چلی گئی اور میں جلد ہی پہلے کی طرح خود کو توانا محسوس کرنے لگا۔

مصری ملازم جا چکا تھا۔ ابوالفرحان میرے پاس سے ہٹ کر سامنے والے صوفے پر جا بیٹھا۔

کچھ دیر بعد میں بھی اُٹھ بیٹھا۔

"مجھے بڑی تشویش ہے!" فرحان بولا۔

"کس بات کی تشویش؟"

"اچانک آپ کو کیا ہو گیا تھا۔؟"

"میں خود نہیں سمجھ سکتا!" میں نے کہا اور پھر انہی دونوں آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"اوہ۔ ۔ !" فرحان نے طویل سانس لی۔

"آپ آرٹسٹ ہیں ایسی ہی دوسری تصویر میرے لئے بھی بنا دیجئے۔" میں نے اُس سے کہا۔

"دوسری تصویر!" اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں۔ ۔ ۔ کیا آپ کو اس میں دشواری ہو گی؟"

"بہت زیادہ۔ ۔ ۔ بلکہ شاید بنا ہی نہ سکوں۔ ۔ ۔ ایک بار جو ہاتھ سے نکل گیا سو نکل گیا۔ ۔ ۔ پھر اس کی نقل میرے لئے محال ہو گئی ہے۔!"

"میرے پاس بہت اچھا کیمرہ ہے۔ ۔ ۔ فلیش گن بھی ہے، میں اس کی تصویر اتار سکوں گا۔ ۔ ۔"

"بھئی آخر آپ ان آنکھوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ ۔ ۔ آج بھی آپ انہی کی طرف دیکھتے دیکھتے بے ہوش ہو گئے تھے۔"

"م۔ ۔ ۔ میں نے۔ ۔ ۔ ان کے گرد ایک مکمل چہرہ دیکھا تھا۔ ۔ ۔ !"

"کیا۔ ۔ ۔ ؟" وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

"یقین کیجئے مکمل چہرہ جس پر یہی آنکھیں تھیں۔"

"اوہ۔ ۔ ۔ اوہ ۔ ۔ ۔" شدتِ جذبات سے اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"پھر میں لاؤں کیمرہ ۔ ۔ ۔"

"نہیں۔ ۔ ۔" اس نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا اور میں اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔!

لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا تھا۔ پہلی سی دل آویز مسکراہٹ دوبارہ ہونٹوں پہ نمودار ہوئی۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا اور شانہ تھپک کر بولا۔

"میرے عجائبات ایسے ہی ہیں۔ ۔ ۔ پھر کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ اس کے نوادرات کی نقل اور کہیں بھی پائی جاتے۔ یہ تصویر میں نے ہی بنائی ہے لیکن اس کا شمار بھی میں اپنے نوادرات میں کرتا ہوں۔"

میں اس کے جواب پر کچھ شرمندگی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ خواہ مخواہ میں نے اُس سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن وہ خواہش۔ ۔ ۔! وہ خواہش "اخلاقی تصنع" پر مبنی نہیں تھی بلکہ حقیقتاً کسی بے اختیارانہ جذبے کی پیداوار تھی۔

ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ۔ ۔!

اس کا انکار گراں گزرا تھا۔ ایک عجیب سی خلش اُس کے خلاف محسوس کر رہا تھا۔

"واقعی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے!" میں اٹھتا ہوا بولا۔ "اب اجازت دیجئے پھر کبھی حاضر ہوں گا۔"

وہ بھی میرے ساتھ ہی اٹھا تھا لیکن غائب دماغی کی سی کیفیت اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔

مجھے دروازے تک پہنچا کر وہ اندر واپس چلا گیا۔!

میں کچھ الجھن میں مبتلا ہوگیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر بیٹھک میں آلیٹا... جب سے گرما کی طویل چھٹیاں شروع ہوئی تھیں قیلولہ جیسی نامعقول عادت کا بھی شکار ہوگیا تھا۔!

ہوسکتا ہے قیلولہ کسی طبعی اہمیت کا حامل ہو لیکن میں ان دنوں اسے فضول ہی سمجھتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی قسم کی مصروفیت نہ ہونے کی بنا پر میں نے اُسے بیکاری کی پیداوار سمجھ کر قبول کر لیا ہو۔

آنکھ لگی ہی تھی کہ وہی آنکھیں موجود۔ ۔ ۔ اور بڑی تیزی سے ان آنکھوں کے گرد ایک چہرہ تشکیل پانے لگا۔ ۔ ۔ پھر پورا مجسمہ سامنے تھا۔

آج بھی سوچتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کیا وہ خواب

تھا؟ وہ بالکل ایسی ہی لگی تھی جیسے گوشت پوست میں ہو۔ جسم پر قدیم مصری لباس تھا اور . . . اور . . . اس کے پیچھے کون تھا؟ . . . میرے خدا . . . یہ تو ابوالفرحان کا مصری ملازم تھا . . . اس کے جسم پر فوجی لباس کچھ عجیب سا لگ رہا تھا . . . وضع قطع قدیم مصری جنگجوؤں جیسی تھی!

پھر میں نے ابوالفرحان کو بھی دیکھا . . . اُس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور لباس خون سے تر تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کسی سے لڑ بھڑ کر آیا ہو۔

لڑکی کے پیچھے کھڑے ہوتے ملازم نے بھی اپنی تلوار کھینچ لی اور ابوالفرحان پر ٹوٹ پڑا۔ ابوالفرحان نے کسی بہت ہی پھرتیلے لڑاکے کی طرح اس کے حملے روکے تھے . . . اور پھر جو اس نے حملہ کیا تو ملازم خاک و خون میں لوٹتا نظر آیا۔

لڑکی کی چیخ بڑی دلدوز تھی۔!

پھر ایک آدمی اور وہاں نظر آیا . . . لڑکی دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی اور وہ آدمی . . . وہ آدمی میں تھا۔ میں نے بھی اپنے جسم پر قدیم مصری جنگجوؤں جیسا لباس دیکھا۔ لڑکی میری پشت پر تھی، اور میں ابوالفرحان کے سامنے تلوار سونتے کھڑا تھا۔

ابوالفرحان کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ پڑی . . . وہ مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھے جا رہا تھا . . . پھر ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ اپنے پیروں پر کھڑے رہنے میں دشواری محسوس کر رہا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا . . . پھر میں نے اُسے اپنے

قدموں میں دم توڑتے محسوس کیا۔

آنکھ کھل گئی۔ سارے جسم سے ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے اور حلق بالکل خشک . . . اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ اُٹھ کر صراحی سے ایک گلاس پانی انڈیل سکتا۔ دل بُری طرح دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔

اس خواب کے ماحول کی مخصوص خوشبو اب بھی ذہن میں چکرا رہی تھی . . . بڑی دیر تک بے حس و حرکت لیٹا رہا . . .

کچھ سکون ہونے کے بعد اٹھا اور صراحی سے پانی انڈیل ہی رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

میں نے خاموشی سے پانی پیا۔ حالانکہ یہ میری عادت کے خلاف تھا . . . عادتاً یہ ہونا چاہیے تھا کہ میں آدھا بھرا ہوا گلاس وہیں رکھ کر پہلے دروازہ کھول کر دیکھتا کہ دستک دینے والا کون ہے۔؟

گلاس رکھ کر میں نے دروازہ کھولا۔

یہ ابوالفرحان تھا . . .!

"مجھے تشویش تھی!" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

میں صورتِ سوال بنا کھڑا رہا۔

"اب آپ کی کیسی طبیعت ہے۔؟"

"الحمدللہ۔ میں ٹھیک ہوں۔ اندر تشریف لائیے!" میں نے کہا۔ لیکن میں نے یہ بات دل سے نہیں کہی تھی پتا نہیں کیوں۔ فوری طور پر میں نے اس کے خلاف اپنے ذہن میں نفرت کی ہلکی سی لہر

محسوس کی تھی

"میں اپنے رویے پر شرمندہ ہوں۔۔۔!" اس نے کہا "آپ کیمرہ لے کر آجایئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ شوق سے ان آنکھوں کی تصویر کھینچیئے۔۔۔!"

ہونا یہ چاہیئے تھا کہ میں انکار کر دیتا۔ اس پر ظاہر کرنے کی کوشش کرتا کہ میری وہ خواہش یونہی رواداری میں تھی۔ میں اس کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کی اس پیشکش پر میں بے ساختہ کھل اٹھا۔

"میں ابھی حاضر ہوا۔۔۔ آپ تشریف رکھیئے" میں نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

"نہیں بس۔۔۔ آپ ہی آجایئے گا!" وہ واپسی کے لئے مڑتا ہوا بولا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ابوالفرحان اور اس کے مصری ملازم کی تصویریں بھی کھینچوں گا۔ کچھ دیر پہلے دیکھا ہوا خواب ذہن سے محو ہو چکا تھا اور اب میں ابوالفرحان کے لئے نفرت بھی نہیں محسوس کر رہا تھا۔

صدر دروازے پر مصری ملازم ہی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے تعظیم دی تھی اور اس کے چہرے پر ایسے ہی تاثرات تھے جیسے مجھے وہاں دوبارہ دیکھ کر اُسے خوشی ہوئی ہو۔

وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لایا۔ میز پر رکھی ہوئی ٹائم پیس شام کے چار بجا رہی تھی۔

"اتنے فاصلے سے آپ کیسے تصویر لے سکیں گے؟" ابوالفرحان نے پوچھا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔۔۔! کیا یہ فریم اتارا نہیں جا سکتا۔!"

"نہیں۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے۔۔۔؟"

"مجھے خوش ہونا چاہیئے!" ابوالفرحان مُسکرا کر بولا۔ "آپ اس حد تک میرے اس شاہکار کے دیوانے ہیں۔۔۔ اچھا ٹھہریئے میں کچھ کرتا ہوں" اس نے گھنٹی بجائی اور مصری ملازم کو بلا کر اس سے کچھ کہتا رہا۔۔۔ مصری ملازم سے جو کچھ بھی کہا گیا۔ غالباً اس کے لئے باعثِ مسرت ہی تھا! دانت نکل پڑے تھے اور وہ تیزی سے دروازے میں داخل ہو گیا تھا۔

پھر ذرا سی دیر میں وہ کئی چھوٹی بڑی میزیں وہاں اٹھا لایا

پھر میز پر میز لگائی جانے لگی۔۔۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد میرا کیمرہ تصویر کے بہت قریب اس کے لیول پر پہنچ گیا تھا۔ آخری میز پر کھڑے ہو کر میں نے اُس فریم کی تصویریں لے ڈالیں۔

اس کا شکریہ ادا کر کے میں نے یہ خواہش بھی ظاہر کر دی کہ اس کی اور اس کے ملازم کی تصویریں بھی ہو جائیں تو بہت اچھا ہے۔

"آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟" وہ مجھے گھورتا ہوا تیز لہجے میں بولا۔

"کیا میری خواہش کوئی اخلاقی پہلو نہیں رکھتی۔"

"جی نہیں! میں اسے پسند نہیں کرتا . . ."

اس کا یہ چڑچڑاپن اُس کی شخصیت سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوا تھا . . . اور میں سچ مچ گہری شرمندگی میں ڈوب گیا۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔"

وہ پھر سنبھل گیا اور نرم لہجہ اختیار کرتا ہوا بولا۔ "میں تصویریں بناتا ہوں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے، آج تک میری کوئی تصویر نہیں بن سکی۔"

"کوئی خاص وجہ ہوگی . . ."

"کچھ بھی نہیں۔" وہ مجھے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"خیر بہرحال میں اصرار نہیں کروں گا۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔ "یہ تصویریں کہاں ڈیولپ کرائیے گا۔"

"میں خود ہی ڈیولپ کروں گا۔ خود ہی پرنٹ بھی کروں گا۔ فوٹوگرافی میری ہابی ہے۔ سب کچھ موجود ہے میرے پاس!"

وہ پھر خاموش ہوگیا۔!

دل چاہ رہا تھا اس کی نہ سہی اس کے پُراسرار ملازم ہی کی ایک تصویر ہو جاتی، لیکن پھر میں نے اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"اب اس وقت میں آپ کو کافی پیش کر سکتا ہوں!" ابوالفرحان بولا۔

اس نے گھنٹی بجانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مصری ملازم بڑی بدحواسی کے عالم میں دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور ایک کرسی سے اُلجھ کر فرش پر ڈھیر ہوگیا۔!

اُس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس تیزی سے چل رہی تھی . . . ابوالفرحان اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر آوازیں دینے لگا، لیکن اس کی آنکھیں نہ کھلیں۔

بالآخر میں نے اُسے بھی دوڑ کر ہی اندر جاتے دیکھا۔ میں ملازم کے قریب ہکا بکا کھڑا تھا۔

دفعتاً اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور میز پر رکھے ہوئے کیمرے کی جانب اشارہ کرکے پھر آنکھیں بند کرلیں۔

مجھے یقین ہے کہ میں غیرارادی طور پر کیمرا اور فلیش گن سنبھال کر اس کی تصویر لی تھی . . . اور ابوالفرحان کی واپسی سے قبل ہی پھر وہ چیزیں دوبارہ پہلے ہی طرح میز پر رکھ دی تھیں۔

ابوالفرحان واپس آیا تو بہت زیادہ پریشان نظر آرہا تھا اور اس کے ہاتھ میں کسی دھات کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی صراحی تھی۔

کمرے کی فضا پر عجیب سی خاموشی مسلط تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مصری ملازم بے ہوش نہیں تھا، لیکن پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔

ابوالفرحان نے صراحی سے چند قطرے اس کے منہ میں ٹپکائے اور کچھ دُور ہٹ کر کھڑا ہو گیا، انداز ایسا ہی تھا جیسے مصری ملازم ان قطرات کا اثر قبول کر کے فوری طور پر ہوش میں آئے گا اور حاضرین کو کاٹنا بھنبھوڑنا شروع کر دے گا۔

کچھ دیر بعد ملازم کے جسم میں حرکت ہوئی اور اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن پلکیں جھپکائے بغیر چھت کو تکتا رہا۔

ابوالفرحان کے چہرے پر پایا جانے والا گوتمی سکون نہ جانے کیوں

درہم برہم ہو گیا تھا، اور وہ کسی عام آدمی کی طرح پریشان نظر آنے لگا تھا۔ دفعتاً وہ ملازم کو آوازیں دے دے کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن مصری ملازم کی آنکھیں بدستور چھت کی طرف لگی رہیں۔

پھر اچانک ابوالفرحان میری طرف مڑا اور قہرآلود نظروں سے گھورتا ہوا زہریلے لہجے میں بولا۔

"اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں جناب۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے کان میں آہستہ سے کہا ہو۔

"خاموشی سے چلے جاؤ۔"

میں غیر ارادی طور پر میز کی طرف بڑھا اور اپنا کیمرہ اٹھا کر دروازے کی طرف مڑ گیا حالانکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ابوالفرحان سے اس اچانک خفگی کی وجہ دریافت کرتا۔

میں گھر آ کر سیدھا ڈارک روم میں پہنچا۔ فلم میں ابھی کئی فریم باقی تھے، لیکن نہ جانے کیوں میں اسے جلد از جلد ڈیولپ کر ڈالنا چاہتا تھا، لیکن افسوس۔ میرے جوش و خروش پر اوس پڑ گئی۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ بعض کیمیکلز بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ ادھر کسی بزرگ نے آواز دی اور میں ڈارک روم سے باہر آ گیا۔

بہر حال شام تک بازار نہ جا سکا، کچھ گھریلو کام نکل آئے تھے، جنہیں نپٹانا تھا۔!

غالباً رات کے نو بجے تھے، جب میں ضروری کیمیکلز خرید کر بازار سے گھر واپس آیا۔ اب اتنی تاب کہاں تھی کہ فوراً ہی فلم کو ڈیولپ کرنے میں نہ لگ جاتا۔

ڈارک روم میں داخل ہوا۔ میز پر کیمیکلز کا پیکٹ رکھ ہی رہا تھا کہ ایک لفافے پر نظر پڑی، جس پر میرا نام تحریر تھا۔

"یہ . . . یہ کہاں سے آیا . . . ؟" اُٹھا کر اُلٹنے پلٹنے لگا، لفافے پر لاکھ کی سیل بھی موجود تھی۔ سیل توڑ کر اندر سے پرچا نکالا۔ کسی نے مجھے مخاطب کر کے لکھا تھا۔

"تصویریں تیار کرو . . . دیکھو . . . اور فوراً ضائع کر دو۔ نگیٹو بھی ضائع کر دینا، جو کچھ دیکھو، اس کا ذکر کسی سے بھی نہ کرنا . . . اگر ابوالفرحان کو ان تصاویر سے متعلق کچھ بھی معلوم ہوا تو تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی . . . اس خط کو لفافے سمیت فوراً تلف کر دو۔"

لکھنے والے نے اپنا نام تحریر نہیں کیا تھا، تحریر کے نیچے جس جگہ اُس کا نام ہونا چاہیئے تھا، نظر پڑنا فطری امر تھا، اچانک ٹھیک اسی جگہ ایک چھوٹی سی تصویر اُبھری "میرے خدا . . . یہ تو ابوالفرحان کے ملازم کی تصویر تھی" پل بھر کے لئے اُبھری اور غائب ہو گئی۔

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے . . . غیر ارادی طور پر میں نے

دیا سلائی کھینچ کر خط اور لفافے میں آگ لگا دی۔

پھر بدحواسی کے عالم میں ڈارک روم سے باہر نکل آیا۔ اب گھر بھر میں ایک ایک سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ کوئی میرے نام کا لفافہ تو نہیں دے گیا تھا۔ ہر ایک سے منفی جواب ملا۔

میرے سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔

میں نے پھر ڈارک روم کی راہ لی . . . پھر مجھے ہوش نہیں کہ کتنی دیر میں فلم کو ڈیولپ کرتا رہا۔ ہوش تو اس وقت آیا تھا جب ڈیولپ کی ہوئی فلم کو روشنی میں دیکھا۔

ان پُراسرار آنکھوں کے گرد ایک مکمل چہرہ موجود تھا اور پھر وہ تصویر . . . ابوالفرحان کے مصری ملازم کی تصویر جب وہ بے ہوش ہو جانے کی اداکاری کر رہا تھا، حیرت . . . وہاں اس وقت اس کے علاوہ اور کون تھا۔

لیکن نگیٹو میں کوئی اور بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ملازم کے قریب ہی جیسے جھک کر اُسے دیکھ رہا ہو۔

ایک گھنٹے کے اندر ہی اندر میں نے ان دونوں تصاویر کے پرنٹ بھی نکال لیے۔

آنکھوں کے گرد مکمل چہرہ . . . کچھ کچھ جانا پہچانا سا، ہو بہو وہی چہرہ جو پل بھر کے لئے مجھے ان آنکھوں کے گرد ابوالفرحان کے ڈرائنگ روم میں نظر آیا تھا . . . وہی چہرہ جو خواب میں نظر آیا

تھا۔

مصری ملازم پر جھکی ہوئی عورت بھی وہی تھی اور اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

میں ان دونوں تصاویر میں کھویا ہوا تھا کہ دفعتاً ایسا معلوم ہوا جیسے زلزلہ آگیا ہو، میرے پیروں کے نیچے زمین ہل رہی تھی اور پھر کوئی سرگوشیاں کرنے لگا۔

"جلا دو۔ ان تصویروں کو جلا دو۔"

میں نے کسی سحر زدہ کی طرح اس حکم کی تعمیل کی اور ڈارک روم سے نکل بھاگا، نیچے صحن میں حسبِ معمول میرے افرادِ خاندان سکون سے لیٹے بیٹھے نظر آتے۔ قطعاً نہیں معلوم تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہو، پھر وہ زلزلہ اور تیز تیز آوازیں۔۔۔ کیا ان لوگوں نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔

میں صحن سے گزرتا ہوا بیٹھک میں چلا آیا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔

"یہ سب کیا ہے۔۔۔ یہ سب کیا ہے۔" میں سوچتا اور ٹہلتا رہا، بیٹھک میں گرمی تھی، لیکن مجھے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ پنکھا ہی چلا دیتا۔

کھڑکیوں سے ابوالفرحان کی پُراسرار قیام گاہ صاف نظر آرہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو ایک کرسی گھسیٹ کر کھڑکی کے قریب

جا بیٹھا۔

سامنے والی عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہیں کسی روشندان میں سے روشنی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی اٹھ رہی تھیں۔۔۔ اور۔۔۔ وہ چہرہ۔۔۔ میں نے اُسے پہلے کہیں دیکھا تھا۔۔۔ کون تھی وہ۔۔۔ لیکن وہ۔۔۔ تو صرف دو آنکھیں تھیں، جن کی تصویریں میں نے لی تھی۔۔۔ چہرہ کیونکر مکمل ہوا۔۔۔ مصری ملازم تنہا تھا۔۔۔ اس کے ساتھ اس عورت کی تصویر کیا معنی رکھتی ہے۔

وہ کون ہے۔۔۔ وہ کون ہے؟۔۔۔ کیا کوئی روح۔۔۔ آج تک تو ایسا کیمرہ ایجاد نہیں ہوسکا، جو روحوں کی تصویریں اتار سکتا۔۔۔ پھر یہ سب کیا تھا۔

میں سوچتا رہا۔۔۔ لیکن ذہن کی کچھ عجیب سی حالت تھی۔ ایسی حالت جس میں کچھ سوچنے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا! پھر بھی ایسا لگتا تھا جیسے برف کی سل پر کچھ پرچھائیاں سی نظر آرہی ہوں۔ اور یہی پرچھائیاں سوچ بن گئی تھیں۔ پھر وہ پرچھائیاں غائب ہوگئیں اور مجھے جو کچھ بھی نظر آیا اسے سوچ نہیں کہا جا سکتا۔۔۔ وہ تو خواب تھا۔ ایک واضح ترین خواب جس کی تفصیل آج بھی یاد ہے۔

میں نے دیکھا جیسے میں کسی سنسان اور نیم تاریک جگہ پر تنہا کھڑا ہوں،

اور سوچ رہا ہوں کہ مجھے کہاں جانا ہے ذہن پہ بالکل ایسا ہی تاثر تھا جیسے
راستہ بھٹک گیا ہوں۔ اچانک ایک طرف روشنی کی باریک سی لکیر نظر آئی۔
جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھتی آرہی تھی۔ میرے پیروں کے قریب
پہنچ کر اس نے کسی سانپ کی طرح بل کھانا شروع کر دیا اور اس کا ایک سرا
ایسے ہی انداز میں اوپر اٹھنے لگا جیسے سانپ پھن اٹھاتا ہے۔ آہستہ آہستہ
روشنی کی لکیر میرے مقابل سیدھی کھڑی ہوگئی۔ پھر اس کا حجم بھی بڑھنے
لگا۔ نہ صرف حجم بڑھا، بلکہ اس نے ایک انسانی ہیولے کی شکل اختیار کرلی۔

"خدایا۔ ۔ ۔ یہ تو۔ ۔ ۔ یہ تو۔ ۔ ۔ ابوالفرحان کا مصری ملازم تھا"

گھٹنوں کے بل گر کر اس نے مجھے تعظیم دی۔ پھر اُٹھ کر ایک طرف
کھڑا ہوگیا جیسے مجھے اسی سمت چلنے کا کہہ رہا ہو۔

میں اُس کے ساتھ چلنے لگا، پھر آنکھوں میں دھند سی چھا گئی،
جیسے کسی فلم کا کوئی منظر "فیڈ آؤٹ" ہوتا ہو۔

اس کے بعد میں نے خود کو قومی عجائب خانے میں دیکھا، مصری
ملازم ساتھ تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھے عجائب خانے کی سیر ہی
کرانے لایا ہو۔

دفعتاً وہ ایک جگہ رکا اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنے سامنے والے
بُت کے آگے گھٹنوں کے بل جھک گیا ہے۔

اور وہ بت۔ ۔ ۔ خدا کی پناہ۔ ۔ ۔ وہی چہرہ۔ ۔ ۔ ہوبہو۔ ۔ ۔
وہی چہرہ۔ ۔ ۔ جو ان پُراسرار آنکھوں کے گرد مکمل ہوا تھا، کسی قدیم

مصری دیوی کا بت تھا۔

میری نظر اس کے پیروں کے قریب رکھی ہوئی تختی پہ جا ٹھہری۔
جس پہ تحریر تھا "دیوی آئسیس"

تو یہ دیوی آئسیس کا بُت تھا۔ دیوی آئسیس جو مصری دیوتا مالک الموت
اوسیرس کی بیوی تھی۔

مصری دیومالا سے مجھے دلچسپی تھی اور نہ جانے کیوں اوسیرس کی موت
میرے لئے ہمیشہ سے عجیب سی کیفیت کی حامل رہی تھی۔ گھنٹوں
بیٹھا سوچتا رہتا کہ وہ بے چارہ محض تفنن طبع کے لئے ایک صندوق
میں بند ہوگیا تھا۔ ۔ ۔ اور اس کے بھائی نے اس صندوق کو دریائے
نیل میں پھنکوا دیا تھا۔

تو وہ آئسیس تھی۔ ۔ ۔ میں اُس کے بُت کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
دیکھتا رہا۔ ۔ ۔ لیکن یہ چہرہ پہلے ہی مجھے کیوں جانا پہچانا سا لگا تھا،
اس سے پہلے تو کبھی میں نے آئسیس کا بُت نہیں دیکھا تھا۔ مجھے
مصری دیومالا سے صرف مطالعے کی حد تک دلچسپی رہی تھی۔ دیوتاؤں
کے بتوں سے متعلق تلاش و جستجو کے خبط میں کبھی مبتلا نہیں رہا
تھا۔

قومی عجائب گھر کے اس حصے میں دُنیا کے مختلف ممالک کے بُت
موجود تھے، لیکن میری نظر آئسیس کے بُت سے نہ ہٹی، مصری ملازم
اب بھی اُس کے قدموں پہ جھکا ہوا تھا۔ دفعتاً وہ اٹھا اور اُلٹے

پاؤں چلتا ہوا میرے قریب آ کھڑا ہوا اور نہایت شستہ اُردو میں
کہنے لگا۔

"اے ربہ — میں تیرا پجاری کاکے طورس ہزار ہا سال سے
سرگرداں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب میں اپنی مراد کو پہنچا ہوں لیکن
اسے روشنیوں والی آتائیفن بھی میرے ساتھ لگا ہوا ہے اور اب میں
کیا کہوں ہم دونوں کی حفاظت تو ہی کرے گی۔"

"ہم دونوں" کہتے وقت اس نے میری طرف دیکھا تھا۔ پھر اس
نے شاید اس بُت کو الوداعی تعظیم دی تھی . . . اور میرا ہاتھ پکڑے
ہوئے تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔ اس بار میں نے دیکھا جیسے ہم
دونوں پیروں سے چلنے کی بجائے فضا میں تیر رہے ہوں!۔

خوابناک دھند چاروں طرف چھائی ہوئی تھی اور ہم کبھی کبھی چمکدار
بادلوں سے بھی گزرتے۔

پھر ایک بار ایسا معلوم ہوا جیسے ہم گہری تاریکی سے گزر رہے
ہوں اب مجھے مصری ملازم دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اپنے قریب
ہی اس کی موجودگی کا احساس بدستور برقرار تھا۔

اس تاریکی سے نکلے تو کانوں میں تاشوں اور نعروں کی آوازیں
آئیں۔ میں نے مصری ملازم کی طرف دیکھا، وہ بھی میری طرف دیکھ کر
مسکرایا، پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔

اب ہم آہستہ آہستہ بادلوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ دفعتاً مصری

ملازم نے مجھے نیچے دیکھنے کا اشارہ کیا۔

یہ ایک بہت بڑے پاٹ والا دریا تھا، جس پر چاندنی چٹکی ہوئی
تھی اور اس کی جھلملاتی ہوئی سطح پر بے شمار بجرے تیر رہے تھے، دریا
کے کنارے میں نے بڑے بڑے محل اور ہیکل دیکھے۔

ایک محل کے ایک دریچے میں بڑی تیز روشنی تھی اور وہاں کچھ لوگ
. . . ایک بڑا صندوق اٹھائے غالباً اُسے نیچے دریا میں پھینکنے کی
کوشش کر رہے تھے، ابوالفرحان کا مصری ملازم بڑے کربناک انداز
میں کراہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

پھر جب وہ صندوق دریا میں پھینکا گیا تو وہ روتے روتے
چیخ پڑا۔

پھر میری آنکھوں میں دھند چھا گئی اور اُس کے بعد منظر
بدلا۔

نیچے دریا کی سطح پر وہ صندوق تیر رہا تھا اور اس کے تیرنے کی
رفتار کے عین مطابق ہم دونوں اوپر فضا میں حرکت کر رہے تھے۔

ابوالفرحان کا مصری ملازم سسکیاں لیتا ہوا بولا "ہیہات ہیہات...
خنط انتی . . . زیرِ زمین دُنیا کا مالک . . . ارواح کی قسمت کا
فیصلہ کرنے والا . . . سبزے کو قوتِ نمو بخشنے والا . . . اس صندوق
میں محبوس ہو کر کتنی بے بسی سے بہا جا رہا ہے۔ میں بھی بے بس ہوں
. . . کچھ نہیں کر سکتا۔ میں آئسیس کا ادنیٰ پجاری کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔

کاش میری رتبہ آئیسس قبل از وقت آگاہ ہوگئی ہوتی کہ اس کا بھائی اور شوہر اوسیرس خود اپنے بھائی کے ہاتھوں موت کی آغوش میں جا سوئے گا۔ ہیہات ۔ ہیہات "

میں نے محسوس کیا کہ وہ سینہ کوبی بھی کئے جا رہا ہے ۔ صندوق بہتے بہتے ایک جگہ کنارے سے جا لگا ۔ دراصل پُرشور لہروں نے اُسے بہت دور خشکی پہ اچھال پھینکا تھا۔ میرے ساتھی کی آہ و بکا میں اور اضافہ ہوگیا۔

پھر مجھے ایسا لگا جیسے ہم دونوں فضا میں معلق ہوگئے ہوں ۔ نہ آگے بڑھ سکتے ہوں اور نہ پیچھے لوٹ سکتے ہوں ۔ پھر ایک عجیب سا احساس ہوا۔ یعنی جیسے اسی حالت میں ہم دونوں نے ایک زمانہ گزار دیا ہو، جس جگہ صندوق گرا تھا وہاں ایک تناور درخت نظر آیا۔

"اب وہ صندوق اس درخت کے تنے کے اندر موجود ہے "مصری ملازم دردناک لہجے میں بولا۔

پھر سورج طلوع ہوا . . . اور ایک جلوس سا نظر آیا جیسے کوئی بادشاہ شکار کے لئے نکلا ہو۔

"یہ بائبلوس کا بادشاہ ہے " مصری ملازم آہستہ سے بولا ۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ درخت کاٹا جانے لگا ۔

"بادشاہ نے اس درخت کے تنے کو اتنا پسند کیا ہے کہ اپنے

زیرِ تعمیر محل میں کسی جگہ اُسے بحیثیت ستون استعمال کرنا چاہتا ہے ۔ ہیہات . . . ہیہات . . . نباتات کے خداوند کا مردہ جسم اس درخت کے تنے میں موجود ہے "مصری ملازم سسکیاں لیتا رہا ۔

درخت کا تنا کاٹ کر ایک ارابے پر ڈال دیا گیا اور کچھ سپاہی اُسے کھینچتے ہوئے لے چلے ۔!

ایک بار پھر میری آنکھوں کے سامنے کہر چھا گئی . . . حسبِ سابق منظر تبدیل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت ویرانے میں سرگرداں ہے . . . عورت نہیں . . . وہ تو دیوی آئیسس تھی . . . مصری ملازم ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

" اے رتبہ میں کتنا مجبور ہوں . . . میں تیری مورتی پر مقدس پانی کے چھینٹے تو دے سکتا ہوں ۔ لیکن تجھے نہیں بتا سکتا کہ تیرے باجرءت شوہر کی لاش کہاں ہے "

پھر ہم دونوں دیوی آئیسس کے ساتھ ساتھ فضا میں پرواز کرتے رہے اور ایک بار پھر بائبلوس جا پہنچے۔ بادشاہ کا محل تیار ہوچکا تھا۔ میں نے اس درخت کے تنے کو بحیثیت ستون فوراً پہچان لیا۔ دیوی آئیسس نے اس ستون کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے بال کھول دیئے ۔ کچھ دیر تک ایک پیر پہ کھڑی رہی، پھر دونوں ہاتھوں کو قوس کی شکل دے کر ایک درد بھرا گیت شروع کر دیا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے، لیکن درد میں ڈوبی ہوئی

آواز کو پہچان لینا مشکل تو نہیں تھا۔ اچانک بابلوس کا بادشاہ دکھائی دیا، وہ تعظیماً آئیسس کے سامنے جھکا تھا۔ آئیسس اس سے کچھ کہتی رہی۔ پھر میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ اس ستون کو وہاں سے اکھاڑ رہے ہیں۔ اچانک منظر بدلا۔ میں نے دیکھا کہ دیوی آئیسس اس ستون کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔

پھر ایک زوردار دھماکا ہوا اور میں اُچھل پڑا۔

اب میری بیٹھک تھی اور میں تھا۔ دیوار سے لگے ہوئے کلاک نے تین بجائے، میرے سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور میں اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھا اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے جا رہا تھا۔

اس وقت ابوالفرحان کی کوٹھی کی کئی کھڑکیوں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں غیر ارادی طور پر کرسی سے اٹھا اور بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

کوئی نامعلوم قوت مجھے کشاں کشاں کوٹھی کی طرف لے جا رہی تھی۔ میں چوروں کی طرح سلاخوں دار پھاٹک پر چڑھا اور دوسری طرف کمپاؤنڈ میں اتر گیا، جیسے ہی رہائشی عمارت کے قریب پہنچا عجیب سا شور سنائی دیا جس میں وزنی چیزوں کے گرنے اور کوٹنے کی آوازیں بھی شامل تھیں، میں پنجوں کے بل چلتا ہوا ایک کھڑکی کے قریب جا پہنچا۔ اب ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ شور میرے

سر ہی پر ہو رہا ہو۔ بڑی احتیاط سے میں نے کھڑکی سے جھانکا۔

یہ ابوالفرحان کے عجائبات کا کمرہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ملازم کو چمڑے کے کوڑے سے مار رہا ہے اور ملازم اس کی زد سے بچنے کے لئے چاروں طرف دوڑتا پھر رہا ہے، اس دھینگا مشتی میں کبھی کوئی شوکیس ٹوٹتا ہے اور کبھی کوئی میز الٹ جاتی ہے دونوں کچھ کہتے بھی جا رہے تھے۔ لیکن زبان میری سمجھ سے باہر تھی۔

ذرا سی دیر میں دونوں ایک دوسرے سے کسی قدر فاصلے پر کھڑے بُری طرح ہانپتے نظر آئے، شاید بہت زیادہ تھک گئے تھے۔ دفعتاً ابوالفرحان نے نفرت سے ایک طرف تھوکا اور کوڑا فرش پر ڈال دیا۔

میرے پیر گویا زمین سے چپک کر رہ گئے تھے۔ کوشش کے باوجود وہاں سے ہل بھی نہ سکا۔

مصری ملازم ہانپ ضرور رہا تھا، لیکن اس کے چہرے پر لاتعلقی کے آثار پائے جاتے تھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی ساری اچھل کود کا تعلق اس کے ذہن سے قطعاً نہ رہا ہو، بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مشین چلتے چلتے رُک گئی ہو۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک ابوالفرحان اسی کھڑکی کی جانب جھپٹا جس میں سے جھانک رہا تھا۔

کھڑکی میں سلاخیں نہیں تھیں۔ قبل اس کے کہ میں پیچھے ہٹتا۔ اُس نے میری گردن دبوچ لی اور جیسے ہی میرا چہرہ روشنی کے مقابل آیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"آپ نجمی صاحب ۔ مجھے حیرت ہے ۔!"

"مم ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ بہت پریشان ہوں فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتا تھا" بوکھلاہٹ میں میری زبان سے نکل گیا۔

"تو پھر اندر تشریف لایئے ۔۔ میں صدر دروازہ کھولتا ہوں" اس نے کہا۔ لہجہ بے حد سرد تھا۔

پھر تھوڑی دیر بعد میں اس کے ڈرائنگ روم میں تھا، مصری ملازم بھی دروازے میں آکھڑا ہوا تھا، وہ مجھے بغور دیکھے جا رہا تھا۔ ابوالفرحان کی پشت اس طرف تھی۔

"ہاں ۔ ۔ ۔ اب بتایئے کیا بات ہے" ابوالفرحان نے پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔

"مم ۔ ۔ ۔ میں نے وہ رول ڈیولپ کرنے کے لئے کیمرے سے نکالا اور میز پر رکھ کر کیمیکلز کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ آگ لگ گئی"

"نہیں ۔ ۔ ۔" ابوالفرحان مضطربانہ انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا ۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ اس کا مصری ملازم دفعتاً مُسکرا پڑا ہے ۔

"یقین کیجئے جناب ۔ ۔ ۔" میں نے اپنے لہجے میں مضبوطی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"بھلا کون یقین کرے گا۔ ایسی انہونی پر ۔ ۔ ۔ پھر خوب ۔ ۔ خود بخود آگ لگ گئی"

"تب تو پھر آپ اس خواب پر بھی یقین نہیں کریں گے جس کی بنا پر میں اس وقت یہاں دوڑا آیا ہوں"

"خواب، کیسا خواب؟" ابوالفرحان چونک پڑا۔

میں نے پھر کنکھیوں سے اس کے ملازم کی طرف دیکھا، جس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لفظ "خواب" نے اسے ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا ہو۔

"کیسا خواب میرے اچھے دوست؟" ابوالفرحان آگے بڑھ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھتا ہوا نرم لہجے میں بولا۔

"ایک بہت ہی اوٹ پٹانگ خواب ۔ ۔ ۔ میں نے دیکھا جیسے ایک عقاب جس کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے میرا کیمرہ پنجے میں دبائے اڑتا ہوا آیا ہے اور اس نے آپ کی کوٹھی پر پہنچ کر وہ کیمرہ نیچے گرا دیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ جیسے ہی چھت پر کیمرہ گرا، پوری عمارت میں آگ لگ گئی اور وہ عقاب چیخ چیخ کر کہنے لگا "غارت کر دوں گا ۔ ۔ ۔ غارت کر دوں گا!"

ابوالفرحان کا چہرہ زرد پڑ گیا ۔ ۔ ۔ پھر میں نے پہلی بار مصری

ملازم کے قہقہے کی آواز سنی۔

ابوالفرحان پلٹ کر دہاڑا اور شاید ملازم کو اشارہ کیا کہ وہ اس کی نظروں کے سامنے سے دور ہو جائے ـــ لیکن مصری ملازم زور زور سے کچھ کہتا ہوا آگے بڑھا، اس کے دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے اور انگلیاں چھوٹے چھوٹے سانپوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔

میں نے ابوالفرحان کی آنکھوں میں خوف زدگی کے آثار دیکھے۔ لیکن وہ بدستور ملازم کی آنکھوں میں دیکھے جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس روّیے پر مجبور ہو . . . کسی طرح بھی ملازم کے چہرے سے نظر نہ ہٹا سکتا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہوتی گئیں اور وہ فرش پر گر کر بے حس و حرکت ہو گیا۔

اس کے گرتے ہی مصری ملازم کی حالت یکسر بدل گئی، پہلے ہی جیسی بے تعلقی کی جھلکیاں اس کی آنکھوں میں نظر آنے لگیں . . . اور پھر اس سے جو حرکت سرزد ہوئی میرے لئے حد درجہ متحیّر کن تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ میرے سامنے اسی طرح دو زانو ہو گیا تھا جیسے میں نے خواب میں اسے آتیس کے مجسمے کے آگے دیکھا تھا۔ ساتھ ہی وہ کچھ کہتا بھی جا رہا تھا۔ لہجہ پُرمسرت تھا، پانچ منٹ تک اس کی تقریر جاری رہی، لیکن میں اس کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا۔

آخر کار وہ اٹھا اور مجھے تعظیم دیتا ہوا صدر دروازے کی طرف لے چلا۔ باہر نکل کر میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ لیکن مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

اس بار مجھے پھاٹک پر چڑھ کر سڑک کی جانب نہیں اترنا پڑا تھا۔ پھاٹک کھلا ہوا ملا، حالانکہ کچھ ہی دیر پہلے جب میں کمپاؤنڈ میں اترا تھا تو پھاٹک مقفل تھا۔

بیٹھک میں واپس آکر میں بستر پر گر گیا، چار بج رہے تھے، لیکن اب آنکھوں میں نیند کہاں تھی۔؟

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے، ابوالفرحان کا مصری ملازم میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔

اب میں اس سے گفتگو کرنا چاہتا تھا . . . بڑی شدید خواہش تھی . . . لیکن کس طرح . . . اس نے اب تک اشاروں میں اپنا مافی الضمیر مجھ پر واضح کیا تھا۔ لیکن اب یاد کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے

جیسے اس نے ایسے الفاظ میں مجھ سے گفتگو کی تھی، جو میرے لئے نئے نہ ہوں۔

بہرحال نہ جانے کیوں اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ شاید انگریزی زبان ہمارے درمیان ذریعۂ اظہار بن سکے۔

بیٹھک میں پہنچ کر میں بستر پر گرا تھا اور غافل ہو گیا تھا۔!

دوسری صبح دن چڑھے تک سوتا رہا۔ . . جاگا تو سب سے پہلے بزرگوں کی جھڑکیاں سننی پڑیں۔ ہمارے یہاں دستور تھا کہ فجر کی نماز سے قبل ہی بچے اٹھا دیتے جاتے تھے، لیکن بڑی دیر تک بیٹھک کا دروازہ پیٹنے کے باوجود بھی اُس صبح مجھے نہیں جگایا جا سکا تھا۔

ناشتے کے بعد اچانک میرے سر میں نیشنل میوزم کی سمائی اور میں ٹھیک دس بجے وہاں جا پہنچا۔

اور پھر جیسے ہی آتیس کے مجسّمے کا سامنا ہوا، پچھلی رات کے خواب کی خوشبو ذہن میں انگڑائیاں لینے لگی۔ آنکھوں میں دھند سی چھا گئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ابوالفرحان کا مصری ملازم آتیس کے مجسمے کے پیچھے سے کسی قسم کے اشارے کر رہا ہو . . .

پھر دھند چھٹ گئی اور سچ مچ مجھے مصری ملازم کی آواز سُنائی دی، اس نے مجھے انگریزی میں مخاطب کیا تھا۔

"صبح بخیر جناب . . . !"

"اوہ . . . تم ہو . . . مجھے حیرت ہے۔"

"کس بات پر حیرت ہے جناب ؟"

"تم بول بھی سکتے ہو۔"

"کئی زبانیں بول سکتا ہوں . . . جناب۔"

"اس انگریزی لباس میں تمہاری شخصیت اور زیادہ پُراسرار لگ رہی ہے۔"

"میرا آقا ابوالفرحان سخت بیمار ہو گیا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے . . . کیا پچھلی رات میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہے۔ ؟"

"ممکن ہے جناب! کیا آپ نے کسی ایسے عقاب کا ذکر نہیں کیا تھا جس کے سر پر تاج تھا۔"

"ہاں۔" بے ساختہ قسم کی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"آپ نے دیدہ دانستہ ایسا کیا تھا۔ ؟"

"ہاں . . . میں نے دیدہ دانستہ ایسا کیا تھا۔ میں جانتا ہوں، وہ عقاب کون تھا۔ ؟"

"کیا مجھے بتانا پسند کریں گے جناب ؟"

"ہورس . . . آتیس کا بیٹا . . ."

پھر میں نے ایک عجیب منظر تھا، ابوالفرحان کا ملازم میرے

سامنے گھٹنوں کے بل فرش پر گر گیا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ آہستہ
آہستہ ہل رہے تھے۔ میں نے بوکھلا کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس
وقت میوزیم کے اس حصے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہ تھا۔
ورنہ شاید یہ احمقانہ سچویشن ہم دونوں کے لئے ہی پریشانی کا سبب
بن جاتی۔

ابوالفرحان کا ملازم جلد ہی اپنی اصلی پوزیشن میں آگیا۔ یعنی
اٹھ کھڑا ہوا "کیا آپ مجھے اپنی خدمت کا موقع دیں گے جناب!"
اس نے ادب سے پوچھا۔

"یقیناً ... یقیناً" میری زبان سے نکلا۔

"میں آپ کو یہاں سے کہیں اور بھی لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ
کو بتانا چاہتا ہوں کہ ابوالفرحان سے خود کو بچاتے رہیئے گا"

"تم بڑی عجیب باتیں کر رہے ہو پُراسرار آدمی" میں نے کہا اور
اس کے ہونٹوں پہ ایک عجیب سی مُسکراہٹ تھی۔

ہم دونوں میوزیم سے باہر آئے اور اس نے ایک چھوٹی سی
کار کی طرف میری رہنمائی کی۔ ... وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔
اور اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے وقت مجھ سے کہا
تھا۔

"جناب عالی، اس وقت آپ پوری طرح مجھے اپنا خادم
سمجھیں ..."

میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا ... اور اس پہ میرے اعتماد کا یہ عالم
تھا کہ میں نے اُس سے کچھ بھی تو نہ پوچھا۔

گاڑی چل پڑی ... مجھ پر خود فراموشی کا سا عالم طاری تھا۔
ہوش نہیں کہ کتنی دیر تک گاڑی چلتی رہی تھی اور کن کن راستوں سے
گزری تھی۔

اور جب ہوش آیا تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ گاڑی ایک قدیم طرز
کی عمارت کے احاطے میں کھڑی تھی اور میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے،
... ابوالفرحان کے مصری ملازم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ انجن ابھی تک
متحرک تھا۔ گویا میں نے گاڑی تو روک دی تھی۔ لیکن انجن بند نہیں
کیا تھا۔

ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ میرے جسم سے چھوٹ پڑا۔ کیونکہ یہ دن کا
اجالا نہیں تھا بلکہ سورج غروب ہو جانے کے بعد کا دھندلکا تھا۔
میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سات بجے تھے ... خداوندا کتنے
گھنٹے گزر گئے۔ دن کے گیارہ بجے تھے جب میں ابوالفرحان کے
ملازم کے ساتھ میوزیم سے باہر نکلا تھا اور پھر فوراً ہی ہم وہاں سے
روانہ ہو گئے تھے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا سفر پورے آٹھ گھنٹے جاری رہا تھا۔
لیکن میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر کیوں تھے۔؟ میں تو پچھلی سیٹ پر بیٹھا
تھا اور ڈرائیونگ ابوالفرحان کے مصری ملازم نے کی تھی۔

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر آیا۔ ابابیلوں کے شور سے فضا گونج رہی تھی، عمارت کے گرد والی چہار دیواری اتنی نیچی تھی کہ اس کے پار بھی دیکھا جا سکتا تھا، چاروں طرف درختوں اور جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نہ دکھائی دیا۔

کیا یہ کوئی ویرانہ تھا۔ ۔ ۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ انجن کی آواز اب بھی سناٹے میں گونج رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کر دیا اور کنجی اگنیشن سے نکال لی ۔

دفعتاً عمارت کی جانب سے آواز آئی "خوش آمدید۔ ۔ ۔ ہزارہا سال کے بعد وہ آرزو پوری ہو گئی، جس نے زبہ آتیسس کے نورانی سینے میں جنم لیا تھا۔ تم گوشت پوست میں آئے ہو۔ ۔ ۔ زبہ آتیمس کا نام روشن رہے۔ !"

اور پھر میں نے دیکھا کہ دس بارہ آدمی جلوس کی شکل میں میری طرف چلے آ رہے ہیں، وہ قدیم مصری پروہتوں کے سے لباس میں ملبوس تھے۔ ایک بار پھر سارے اندیشے میرے ذہن سے محو ہو گئے اور خود فراموشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

وہ جلوس قریب آ گیا، سب سے آگے چلنے والے کے ہاتھ میں مشعل تھی اور مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ابوالفرحان کا مصری ملازم تھا۔

میرے قریب پہنچ کر وہ سب گھٹنوں کے بل گر گئے۔ ۔ ۔

ابوالفرحان کا ملازم پیش پیش تھا۔

میں نے اس کے جسم پر بھی پروہتوں ہی کا سا لبادہ دیکھا، حالانکہ میرے سفر شروع کرتے وقت وہ بہترین تراش کے سوٹ میں ملبوس تھا۔

خود مجھ میں اب متحیر ہونے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ مجھے اس عمارت میں اسی طرح لے گئے جیسے کسی قدیم بادشاہ کا جلوس جا رہا ہو۔ ایک بڑے ہال میں انہوں نے قیام کیا، یہاں کا ماحول قدیم مصری ہیکلوں کا سا تھا۔ میں نے وہ جگہ پہچان لی، جسے قربان گاہ کہا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ اس شناخت کو میں اپنے کتابی علم پر محمول نہ کر سکا، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ قربان گاہ میں آگ روشن تھی۔ جس میں ایک پروہت مٹھیاں بھر بھر کے۔ ۔ ۔ سوختنی خوشبویات پھینک رہا تھا۔

دھوئیں سے فضا مہکی ہوئی تھی، میں قربان گاہ کے نیچے آخری سیڑھی کے قریب کھڑا تھا۔ دفعتاً ابوالفرحان کا ملازم آگے بڑھا اور قربان گاہ پر رکھے ہوئے پتھر کے مرتبان سے آب مقدس نکال کر مجھ پر چھڑکتا ہوا کسی نامانوس زبان میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ اس کے بعد قربان گاہ کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں کوئی چیز ڈال دی۔ ۔ ۔ سفید رنگ کا گہرا دھواں اوپر اٹھا اور آتشدان

سے چھت تک دھوئیں کی ایک چادر سی تن کر رہ گئی۔

اور اچانک میں نے محسوس کیا جیسے اس عمارت میں تنہا رہ گیا ہوں۔۔ اس شبہے کی تصدیق کے لئے مڑ کر دیکھا، نہ ابوالفرحان کا ملازم دکھائی دیا اور نہ ان میں سے کوئی جنہوں نے میرا استقبال کیا تھا۔

دھوئیں کی چادر پر مجھے ایک ہرا بھرا جنگل نظر آیا۔ بس ایسا لگتا تھا جیسے کسی سینما ہال کے اسکرین پہ کوئی فلم چل رہا ہو۔۔۔ رنگین فلم۔۔۔

ہرے بھرے جنگل میں کچھ لوگ نظر آئے، جن کے جسموں پر سفید لبادے تھے۔۔۔ یہ تو کسی کا تابوت تھا کچھ لوگ اسے اپنے کاندھوں پہ اٹھائے چل رہے تھے۔۔۔ اور۔۔۔ ان کے آگے ایک عورت تھی جس نے اپنے بال ماتمی انداز میں بکھرا رکھے تھے۔۔۔ یہ آئیسس تھی۔ یہ باتبلوس سے اپنے شوہر اوسیرس کا تابوت لائی تھی۔ آئیسس۔۔۔ آئیسس۔ میں نے اُسے کب اور کہاں گوشت و پوست میں دیکھا تھا، کہاں دیکھا تھا۔۔۔ وہ اپنے شوہر کا تابوت چھپانے کے لئے کسی مناسب سی جگہ کی تلاش میں تھی۔ تابوت گھنی جھاڑیوں میں رکھ دیا گیا۔۔۔ اور منظر آہستہ آہستہ دھندلانے لگا۔۔

اور پھر دھوئیں کی سپاٹ چادر پہ کچھ بھی نہ تھا۔۔۔ لیکن ایک پل بھی نہیں گزرا تھا کہ ہرا بھرا جنگل دوبارہ دکھائی دیا۔ کچھ لوگ انہیں جھاڑیوں کے قریب کھڑے نظر آئے جہاں آئیسس نے اوسیرس کا تابوت چھپایا تھا۔۔۔ اوہو۔۔۔ یہ کون؟ خداوندا۔۔۔ اب

کیا ہوگا۔۔۔ یہ تو وہی ظالم تائیفن ہے جس نے اپنے بھائی اوسیرس کو دریائے نیل میں پھنکوا دیا تھا۔۔۔ اب کیا ہونے والا ہے۔۔۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے تائیفن کے بدمعاش مصاحب جھاڑیوں میں گھسے اور تابوت کا ڈھکنا ہٹا کر اوسیرس کی لاش ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔ میرے دل پر غم کے بادل چھا گئے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے بھائی نے میری لاش کے ٹکڑے کرا دیئے ہوں۔

منظر دھندلانے لگا۔۔۔ اور میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔۔۔

تیسری بار آئیسس کا ہیکل نظر آیا، لاش کے ٹکڑے ٹکڑے قربان گاہ پر بکھرے ہوئے تھے اور آئیسس غیظ و غضب کا پیکر بنی ہوئی چیخ رہی تھی۔۔۔ "کاکے طورس۔۔۔ کاکے طورس" وہ قربان گاہ کی نچلی سیڑھی کے قریب کھڑی تھی، بائیں جانب سے ایک مرد نمودار ہوا اور اس کے قدموں میں جھک گیا۔۔۔ وہ داہنا ہاتھ اُٹھا کر بولی "اُٹھ اور طلائی ابابیل کی سی اڑان کے ساتھ میری بہن ربہ نفتھا تیسس کے پاس پہنچ اور اس سے کہہ کہ تیرے بھائی کی لاش کے بھی ٹکڑے کر دیئے"

وہ اٹھ کر مڑا۔۔۔ اور میں چونک پڑا۔۔۔ وہ تو۔۔۔ وہ تو ابوالفرحان کا ملازم تھا۔۔۔ اس کا مڑنا ہی تھا کہ منظر بدل گیا۔ دوسری عورت نظر آئی۔۔۔ ابوالفرحان کا ملازم یا کاکے طورس اس

کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑا تھا . . . اور وہ سینہ پیٹ پیٹ کر آہ وزاری کر رہی تھی۔

یہ آئیسس کی بہن دیوی نفتھائیس تھی، گریہ وزاری کے بعد اس نے اپنے عصا کا دوسرا سرا کاکے طورس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کچھ کہا . . . اور میں نے دیکھا کہ وہ دونوں فضا میں بلند ہو رہے ہیں۔ بادلوں کے درمیان پرواز کرتے ہوئے وہ آئیسس کے ہیکل تک پہنچے تھے۔

منظر دھندلا کر معدوم ہو گیا . . . نہ صرف منظر معدوم ہو گیا، بلکہ دھوئیں کی وہ سفید چادر بھی غائب ہو گئی، جو آتشدان سے چھت تک بنی ہوئی تھی۔

میں نے اپنی آنکھیں مل مل کر کئی بار خلا میں گھورا۔ حقیقتاً وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا . . . میں قربان گاہ کی آخری نچلی سیڑھی کے قریب کھڑا تھا اور ابوالفرحان کا ملازم میرے قدموں پر اسی طرح جھکا ہوا نظر آیا، جیسے کچھ دیر پہلے دھوئیں کی چادر پر دیوی آئیسس کے حضور دکھائی دیا تھا۔ "کیا سچ مچ تمہارا نام کاکے طورس ہی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں میرے آقا . . ." اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"یہ سب کیا تھا۔؟"

"یہ سب کیا تھا۔؟"

"پچھلی رات آپ نے جو خواب دیکھا تھا، اس کا بقیہ حصہ . . . لیکن یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ میرے آقا۔"

"اس کے بعد مجھے کیا ہوا تھا۔ مجھے بتاؤ۔"

"دونوں بہنوں نے لاش کے ٹکڑے یکجا کر کے اوسیرس کو زندہ کرنا چاہا تھا، لیکن اس کے جسم کا وہ حصہ، جو اس کی نسل کو آگے بڑھاتا ہے۔ غائب نظر آیا، پہلے آکسی رہائینچس مچھلی نگل گئی تھی۔ بہرحال دونوں بہنوں کے سحر نے اُسے زندہ کیا، لیکن اس کی زندگی عالم ارواح کی زندگی سے آگے نہ بڑھ سکی . . . اور آئیسس اپنے سحر ہی کے ذریعے اوسیرس کے بچے ہورس کی ماں بھی بنی تھی، ہورس جو مجسم انتقام تھا . . . . اس نے اوسیرس کے قاتلوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا، اس کے کئی بہروپ تھے، کبھی ادھ کھلے کنول کے درمیان ایک ننھے سے معصوم بچے کے روپ میں دکھائی دیتا اور کبھی . . . " اچانک ابوالفرحان کا ملازم خاموش ہو کر مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ میرے لئے مشکل تھا کہ اُس کے اِس انداز کو کوئی معنی پہنا سکتا، لہٰذا میں نے کہا۔

"تم خاموش کیوں ہو گئے۔؟"

"میں تم سے پوچھتا ہوں میرے آقا . . . کہ تم نے پچھلی رات ابوالفرحان کو جھوٹا خواب کیوں سُنایا تھا، تم وہ عقاب کہاں سے لائے تھے جس کے سر پہ تاج تھا . . ."

”میں کچھ نہیں جانتا . . . مجھے کچھ نہیں معلوم کہ میری زبان سے وہ ساری باتیں کیونکر نکلی تھیں“ ”تم سچے ہو میرے آقا . . . لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں . . . وہ تاجدار عقاب بھی ہورس ہی تھا، وہ عقاب ہی کی طرح اپنے باپ اوسیرس کے قاتلوں پر جھپٹا تھا، اس نے اوسیرس کا نام اونچا رکھا . . . حتیٰ کہ اپنی ایک آنکھ بھی گنوا بیٹھا تھا . . . اس کی ایک آنکھ ضائع ہوتے ہی چاند آسمان سے غائب ہوگیا تھا۔“

”لیکن . . . لیکن . . . میرے جھوٹے خواب نے ابوالفرحان کو کیوں حواس باختہ کر دیا تھا۔ ؟“

”تم اس طرح نہیں سمجھ سکو گے میرے آقا . . . آؤ میرے ساتھ . . . میں تمہیں کچھ دکھاؤں۔“

اس کے بعد میرا جلوس ایک تنگ سی راہداری سے گزر رہا تھا، سالخوردہ سنگین دیواروں پر مشعلوں کی سرخ روشنی بڑی پُراسرار لگ رہی تھی . . . بے حد عجیب . . . ہماری گہری پرچھائیوں نے اسے اور بھی عجیب بنا دیا تھا۔ اچانک میں نے اپنے پیچھے آنے والوں کے درمیان سراسیمگی سی محسوس کی اور انہیں . . . اس طرح بھاگتے دیکھا جیسے بھیڑیئے کی بو پاکر بھیڑیں بھاگتی ہیں۔ صرف ابوالفرحان کا ملازم میرے قریب کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

”یہ کیا ہوا . . . کیا بات ہے . . .“ میں نے اس سے پوچھا۔

”مجھے میرے نام سے مخاطب کرو میرے آقا . . . تب ہی میں تمہارے لئے سینہ سپر ہو سکوں گا۔ سن رہا ہے تائیفن . . . ازراعندہ . . . کاکے طورس۔“

”ہاں میرے آقا . . . اب میری رگوں میں دوڑنے والا خون مجھے تائیفن سے ٹکرا جانے پر مجبور کر دے گا۔“ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے لبادے کے نیچے سے تلوار نکالی اور مجھے اپنی پشت پر لے کر کسی اندیکھے خطرے کے لئے سینہ سپر ہوگیا، اس کے بائیں ہاتھ میں مشعل تھی اور داہنے ہاتھ میں تلوار، دو تین مشعلیں فرش پہ پڑی جل رہی تھیں، جو اُس کے ساتھی چھوڑ بھاگے تھے . . . دو مشعلیں میں نے اٹھا لیں۔ دفعتاً راہداری کے دوسرے سرے پہ ایک آدمی دکھائی دیا جس نے قدیم مصری فوجی لباس پہن رکھا تھا اور پھر جیسے ہی وہ روشنی میں آیا میرے ہاتھوں میں مشعلیں کانپ گئیں۔ وہ تو ابوالفرحان تھا۔

”کاکے طورس . . .“ ابوالفرحان نے تلوار کو جنبش دے کر اپنے ملازم کو للکارا۔

”میں کاکے طورس . . . آئیس کا پجاری . . . اوسیرس کا خادم . . . تیرا منتظر ہوں۔“ اور وہ شور مچاتا ہوا ابوالفرحان پر جھپٹا۔ لیکن ابوالفرحان کی ایک ہی ضرب اسے فرش پہ لے آئی . . . اس کے بعد ابوالفرحان نے مجھے للکارا . . . میرے دونوں ہاتھوں

میں شعلیں تھیں، میں انہیں ایک مخصوص انداز میں گردش دیتا ہوا اس
کی طرف بڑھا۔ ۔ ۔ اور ساتھ ہی کاکے طورس کی آواز سُنی جو کہہ رہا
تھا۔ ۔ ۔ میرے آقا ہوشیار۔ ۔ ۔ یہ مکاری میں طاق ہے۔ ۔ ۔
ہوشیار میرے آقا۔ ۔ ۔" قدیم فنِ سپہ گری کا میں نے نہ صرف مطالعہ کیا
تھا بلکہ ایک استاد سے بہت دنوں تک عملی تربیت بھی حاصل کی تھی۔
ابوالفرجان کو مجھ پر حملہ کرنے کی مہلت ہی نہ مل سکی اور میں اُسے
دوڑاتا ہوا اسی ہال تک لے آیا، جہاں قربان گاہ تھی۔ مقصد یہ تھا کہ
کسی طرح کوئی کشادہ جگہ ملے اور میں اس سے نپٹ لوں۔ مشعلیں
میرے ہاتھ میں تیزی سے گردش کر رہی تھیں اور وہ اس تاک میں
تھا کہ کسی طرح اُسے تلوار سے حملہ کرنے کا موقع مل جائے ۔
اچانک میں نے ایک مشعل اس کے منہ پر پھینک ماری، وہ چیختا
ہوا چاروں خانے چت گرا۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ مجھ پر
تلوار پھینک مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

جیسے ہی وہ گرا۔ میں نے دوسری مشعل کے جلتے ہوئے سرے
سے اس کے جسم پر ضربیں لگانی شروع کر دیں۔ وہ چیختا رہا۔ ۔ ۔
اور میں اس کی مرمت کرتا رہا۔ ۔ ۔ اچانک عمارت کے کسی تاریک
گوشے سے بے شمار چمگادڑیں چیختی ہوئی نکلیں اور مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔
پھر مجھے ہوش نہیں کہ کیا ہوا۔ ۔ ۔ ایسی بدحواسی مجھ پر مسلط ہوئی
تھی کہ سب کچھ بھول گیا تھا۔۔ دوبارہ ہوش آیا تو میں نے خود کو

قربان گاہ پر پایا۔ ۔ ۔ چت پڑا ہوا تھا اور خود میں اتنی سکت بھی
نہیں پاتا تھا کہ گردن گھما کر کسی دوسری طرف دیکھ سکتا۔
"میرے آقا۔ ۔ ۔ میرے آقا۔ ۔ ۔" میں نے کاکے طورس کی نرم آواز
سنی۔ ۔ ۔ اور آنکھیں کھول دیں۔ "تم وہی ہو میرے آقا۔ ۔ ۔ بالکل وہی
۔ ۔ ۔ نرم دل اور خوفناک۔ ۔ ۔ اگر وہ منحوس چمگادڑیں اچانک
حملہ آور نہ ہوتیں تو آج تائیفن ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا۔ ۔" کاکے طورس
کہتا رہا اور میں حیرت سے سنتا رہا۔ پھر اُس نے مجھے سہارا دے کر
اٹھایا۔ ۔ ۔ اور میں نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"وہ کہاں گیا؟"

"اس کی پرستار چمگادڑیں اُسے بچا لے گئیں۔ ۔ ۔"

"تم زخمی تو نہیں ہوئے۔ ۔؟"

"میں نے اس کا وار اپنی تلوار پر روکا تھا۔ ۔ ۔ لیکن میں اس
کا مقابل کیونکر ہو سکتا ہوں میرے آقا۔ ۔ ۔ وہ دیوتا ہے۔ ۔ ۔
اور میں محض ایک پجاری۔"

"لیکن میں کیا ہوں۔ ۔ ۔ یہاں کیوں ہوں۔ ۔ ۔ اور۔"

"تم پر سب کچھ منکشف ہو جائے گا میرے آقا۔ ۔ ۔ بہت جلد۔"
کاکے طورس نے کہا اور ایک پیالہ میرے دونوں ہاتھوں میں تھماتا
ہوا بولا "یہ مشروب تمہاری توانائی واپس لائے گا۔"
بڑا خوش ذائقہ مشروب تھا، جس کا ہر گھونٹ مجھے ہوش میں

لایا گیا اور جب میں اُسے خالی پیالہ واپس کر رہا تھا تو سچ مچ مجھ میں پہلے ہی کی سی توانائی موجود تھی۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔۔ ۔ قربان گاہ کے نیچے وہ سب لوگ دکھائی دیتے جو ہم دونوں کو راہداری میں چھوڑ بھاگے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ سب فرش پر اوندھے گر گئے اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں۔۔؟" میں نے کاکے طورس سے پوچھا۔

"اظہارِ ندامت میرے مالک۔۔ ۔ انہیں معاف کر دو۔ یہ فانی انسان ہیں۔۔ ۔ دیوتاؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔۔ ۔ میں آتیس کا خادمِ خصوصی ہونے کی وجہ سے تائیفن کا ایک وار سہہ گیا تھا۔"

"اچھا تو ان سے کہو کہ سیدھے کھڑے ہو جائیں۔"

کاکے طورس نے انہیں اُٹھ جانے کا حکم دیا۔ وہ اٹھے اور کسی نامعلوم زبان میں کچھ کہتے رہے، لیکن میرا ذہن ان کے مافی الضمیر سے آگاہ ہوتا جا رہا تھا، وہ نہ صرف اپنی کمزوریوں کا اعتراف کر رہے تھے بلکہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ انہیں کم از کم اتنا طاقتور تو ہونا ہی چاہیئے کہ ایسے حالات میں میرے کام آ سکیں۔۔ ۔!"

میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں تشفی دی۔

"بالکل وہی۔۔ ۔ بالکل وہی۔" کاکے طورس بڑبڑایا۔ میں نے اُسے چونک کر دیکھا۔

"اب میرے مالک!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "وقت

آ گیا ہے۔۔ ۔ تائیفن کو شکست نصیب ہوئی۔ اب کون ہے جو ہمیں روک سکے۔" اس کے بعد اس نے مجھے قربان گاہ سے اترنے کا اشارہ کیا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم اسی راہداری سے گذر رہے تھے۔۔ ۔ کاکے طورس اس بار بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔ راہداری کے اختتام پر ہمیں ایک تہہ خانہ میں اترنا پڑا۔ تہہ خانے سے زیادہ اسے عجائب خانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بے شمار قیمتی ظروف اور دوسری ضروریاتِ زندگی چاروں طرف بکھری پڑی تھیں اور پورا فرش بیش قیمت قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ خوبصورت عورتیں تھیں جو بتوں کی طرح بے حس و حرکت تھیں۔

"تم انہیں حیرت سے دیکھ رہے ہو میرے مالک۔" کاکے طورس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ایک دن یہ سب زندہ ہو جائیں گے۔ سوائے اس کے۔" وہ ایک بڑے تابوت کی طرف اشارہ کر کے خاموش ہو گیا تھا۔

"اس میں کیا ہے کاکے طورس۔۔ ۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں اسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میرے مالک۔۔ ۔ بائیں ہاتھ میں مشعل پکڑو اور داہنے ہاتھ سے اُس کا ڈھکنا ہٹا کر خود دیکھ لو۔۔ ۔"

میں نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ جلدی سے گھٹنوں کے بل گر کر

کرگڑگڑانے لگا کہ وہ حقیقتاً اُسے ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔

میں نے جھلّا کر اس کے ہاتھ سے مشعل چھینی اور بے خوفی سے تابوت کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ڈھکنا بہت وزنی تھا، مگر اس وقت نہ جانے کس بلا کی قوّت مجھ میں آگئی تھی کہ میں نے ایک ہی جھٹکے میں اُسے اٹھا دیا۔ ۔ ۔ اور پھر ۔ ۔ ۔ اس لاش پر میری نظر پڑی۔ ۔ ۔ ہزارہا سال پُرانی لاش ۔ ۔ ۔ میری اپنی تھی ۔ ۔ ۔ اگر گلہری کی دم سی داڑھی چہرے سے ہٹا دی جاتی، تو وہ سو فیصد میں تھا ۔ ۔ ۔ میں یعنی کہ نجمی ۔ ۔ ۔ !

. . . . . .

عجیب سا سنّاٹا طاری تھا۔ ازلی اور ابدی سنّاٹا ۔ ۔ ۔ دفعتاً وہ سب مل کر گانے لگے اور میں تابوت کو بند کر کے پیچھے ہٹ آیا۔

پھر میں آوازوں کی طرف مڑا اور میں نے دیکھا کہ وہ لوگ زمین پر اوندھے پڑے گا رہے ہیں، کاکے طورس بھی ان میں شامل تھا ۔ ۔

وہ یقیناً عبدیت کا اظہار تھا، میں نے یہی محسوس کیا ۔ ۔ نہ صرف یہ بلکہ چند لمحات کے لئے اپنی ٹھوڑی پر گلہری کی لمبی دم جیسی داڑھی بھی محسوس کی ۔ ۔ ۔ میرے بائیں ہاتھ میں مڑے ہوئے سرے والا عصائے شاہی بھی تھا، لیکن جیسے ہی کاکے طورس گیت ختم کر کے اٹھا، داڑھی بھی غائب ہو گئی اور عصائے شاہی بھی فضا میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔

اتنی گہری سنجیدگی پہلی بار کاکے طورس کے چہرے پر نظر آئی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"ہاں تو میرے مالک میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس جسم میں روح کبھی واپس نہیں آئے گی کیونکہ وہ لاش نامکمل ہے، اس میں روح واپس بھی آتی تو وہ زندگی کو آگے بڑھانے کی صلاحیت سے محروم ہوگا ۔ ۔ ۔ یہ لاش ہمیشہ بے جان پڑی رہے گی، اس کی روح کو ایک دن بالکل ہی نیا جسم لے کر پیدا ہونا تھا ۔ ۔ ۔ یہ شرف ادیرس خنطامنتی کے علاوہ اور کسی دیوتا کو حاصل نہ ہو سکا۔"

"تت ۔ ۔ ۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں ۔ ۔ ۔ یعنی کہ میں۔"

"بس میرے آقا ۔ ۔ ۔ آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے کہا اور پھر میرے آگے زمین بوس ہو گیا۔

دوبارہ اٹھا تو اس کی آنکھیں کچھ عجیب سی لگیں، ان میں اداسی اور خونخواری کے امتزاج نے اس کے چہرے کو بیحد پُراسرار بنا دیا تھا۔

"اب یہ وسیع دنیا میرے آقا!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "تمہارے نہ تھکنے والے قدموں کی منتظر ہے ۔ ۔ ۔ میری معبود وہ آئیسس ۔ ۔ ۔ کہیں نہ کہیں تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"آئیسس ۔ ۔ ۔ آئیسس۔" میں آہستہ سے بڑبڑایا اور مجھے اپنے سینہ میں نرم سی آنچ محسوس ہوئی۔

"میں ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ادیرس ہوں ۔ ۔ ۔" میرے کانوں نے

میری آواز سنی لیکن یہ آواز کتنی اجنبی سی تھی۔

"ہاں میرے آقا . . . تم ادیبرس ہو . . . اور تمہیں اپنے چاچے تائیفن کو سزا دینی ہے" کاکے طورس بولا۔

"میں اُسے سزا دوں گا"

"لیکن اس سے پہلے میرے آقا . . . تمہیں بہت کچھ کرنا پڑے گا"

"مجھے کیا کرنا ہے کاکے طورس"

"افسوس میرے آقا . . . میں کچھ نہیں جانتا . . . اگر تم اپنے پرانے جسم میں واپس آتے ہوتے تو تمہیں سب کچھ یاد آجاتا"

"پھر میں کیا کروں؟"

"سب سے پہلے ربۃ آئیسس کو تلاش کرنا پڑے گا وہی رہنمائی کرے گی"

"میں اُسے کہاں تلاش کروں"

"ابوالفرحان یا تائیفن جانتا ہے لیکن تمہاری مدد کے بغیر اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لئے اس نے تمہارے گرد ان دو آنکھوں کا جال پھیلایا تھا۔ میں نے اس سے لاکھ چھپانے کی کوشش کی، لیکن اس پہ یہ بات ظاہر ہوگئی' اسی لئے اس وقت وہ یہاں آیا تھا"

"تو پھر اب کیا ہوگا کاکے طورس"

"حکمت عملی سے کام لینا پڑے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے تمہیں فریب دے کر اس صندوق میں پہنچایا تھا"

"ہاں شاید۔ میں نے دیکھا تھا"

"کیا دیکھا تھا میرے آقا"

"میں نے کہا تھا کہ میرے قبضۂ قدرت میں کیا نہیں تھا۔ اس پر اسد میرے بھائی نے جسے تم نفرت کی بنا پہ تائیفن کہتے ہو کہا تھا اگر تم اس صندوق میں بند ہو کر اپنی قوت سے . . . باہر نکل آؤ تو میں تسلیم کر لوں گا کہ تم واقعی قوت والے ہو۔ میں صندوق میں بند ہو گیا . . . تب مجھے یاد آیا کہ . . . ایک بار میرے باپ زمین کے مالک گیب نے کہا تھا کہ تم سے ایک غلطی سرزد ہوگی اور وہی تمہاری موت کا باعث بنے گی . . . اپنے بھائی اسد سے ہمیشہ ہوشیار رہنا . . . وہی ہوا . . . اسد نے اس صندوق کو طلسم سے بند کر کے دریائے نیل میں پھینکوا یا اور میں . . . اور . . . میں"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری قوتِ گویائی جواب دے رہی ہو . . . میرا دم گھٹنے لگا . . . آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور پھر مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔

دوبارہ ہوش آنے پر میں نے خود کو اپنے دروازے پر کھڑا پایا۔ اور میری ماں ڈیوڑھی میں کھڑی مجھ پر گرج برس رہی تھیں" کہاں دھوپ میں مارا مارا پھرتا ہے بدبخت لو لگ گئی تو کیا ہوگا . . . چل اندر گرمیوں کی چھٹیاں آوارہ گردی کے لئے نہیں ہوتیں۔

میں مردہ چال سے گھر میں داخل ہوا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے

بڑبڑاتی چلی آ رہی تھیں۔

مجھے حیرت تھی۔ ۔ ۔ سخت حیرت۔ ۔ ۔ میں نے پورا ایک دن اور پوری ایک رات گھر کے باہر گزاری تھی، لیکن وہ اس طرح خفا ہو رہی تھیں جیسے میں صرف گھنٹہ دو گھنٹے غائب رہا ہوں۔ ۔ ۔ تیز دھوپ میں آوارہ گردی کی ہو۔

بیٹھک میں داخل ہوا۔ قبلہ والد صاحب آرام کرسی پر نیم دراز تھے مجھے دیکھ کر سیدھے ہو بیٹھے اور خونخوار لہجے میں غرائے۔

"گرمیوں کی چھٹیاں اس لئے ہوتی ہیں کہ تم اگلے درجے کی تیاری کرو۔"

"جی۔ ابھی تو میں یہی فیصلہ نہیں کر سکا کہ بی۔اے میں کون سے مضامین لوں۔"

"مضامین کو جہنم میں جھونکو۔ ۔ ۔ تم انگریزی میں تو تیاری کر ہی سکتے ہو۔"

"جج۔ ۔ ۔ جی ہاں۔ ۔ ۔ میں نے کمپلسری انگلش کی کتابیں خرید لی ہیں اور انہیں پڑھ رہا ہوں۔"

"خیر انہیں جہنم میں جھونکو۔ ۔ ۔ فی الحال تمہیں۔ ۔ ۔ چار بجے والی ٹرین سے گاؤں جانا ہے۔"

"جج۔ ۔ ۔ جی۔ ۔ ۔ گگ۔ ۔ ۔ گاؤں" میں ہکلایا۔

"ہاں ابھی نوٹس ملا ہے کہ سرکاری لگان ادا نہیں ہو سکا۔ ۔ ۔

کارندہ بیمار ہے۔ تم جا کر اس سے رقم لے لو اور تحصیل میں جمع کرا دو۔"

"جی۔ ۔ ۔ مجھے تو یہ سب نہیں آتا۔"

"سیکھنے سے آئے گا، بس جاؤ تیاری کرو۔" انہوں نے کہا اور اٹھ کر زنان خانے میں چلے گئے، کچھ دیر بعد ملازم ان کا حقہ بھی اٹھا لے گیا۔

گاؤں کے نام سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ ۔ ۔ ایک دن بھی میرے لئے گزارنا دشوار ہو جاتا تھا۔

بہر حال جانا تو پڑتا۔ ۔ ۔ والد صاحب کا حکم تھا، جو کسی صورت سے نہیں ٹل سکتا تھا، کھڑا بور ہو رہا تھا کہ اچانک میری نظر کھڑکی سے گزر کر سامنے والی کوٹھی پر پڑی۔ ذہن میں جھماکا ہوا اور پچھلے واقعات تیزی سے یادداشت کی سطح پر ابھرنے لگے۔ ۔ ۔ کالے طوس۔ ۔ ۔ ٹائیفن اور سیرس۔ ۔ ۔ اور پھر میں نے واضح طور پر ایک نسوانی آواز سنی۔

"میرے مالک!۔ ۔ ۔ ابوالفرحان کو بھی اپنے ساتھ گاؤں لے جاؤ۔"

"ابوالفرحان" میں غیر ارادی طور پر دانت پیسنے لگا۔ سر سے پیر تک غصے میں تپ اٹھا تھا، پھر آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑتا گیا اور میں نے سوچا کہ مجھے فوری طور پر ابوالفرحان سے ملنا چاہیئے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر باہر نکل آیا، اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ دس بجے

یں نیشنل میوزیم میں داخل ہوا تھا اور ٹھیک بارہ بجے گھر واپس آیا تھا، یعنی
صرف دو گھنٹے گھر سے باہر رہا تھا پھر وہ پورا دن . . . اور پوری رات کس
کھاتے میں جائیں گے۔

تو میں ادیپرس ہوں . . . اور مجھے آئیسس کی تلاش ہے . . . .
خداوندا یہ کیا بھید ہے۔

میں مسلمان ہوں، اس پر یقین نہیں رکھتا کہ روحیں اجسام بدلا کرتی ہیں
. . . لیکن پھر وہ ادیپرس کی لاش . . . کاکے طورس کا بیان . . . یہ
سب کیا ہے۔

میں ابوالفرحان کی کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا اور درختوں کی
چھاؤں سے گزرتا ہوا صدر دروازے تک جا پہنچا۔

کال بیل کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا، اس کا
ملازم کاکے طورس سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا کسی قدر جھک کر اس نے مجھے تعظیم
دی، لیکن اس کے چہرے پہ گونگے پن کا سا تاثر موجود تھا۔

وہ مجھے نشست کے کمرے میں چھوڑ کر اندر چلا گیا . . . ابوالفرحان
جلد ہی دکھائی دیا تھا، اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں
ویرانی تھی اور شیو بڑھا ہوا تھا . . .

مجھ سے مصافحہ کرتے وقت نحیف سی آواز میں بولا۔

"میں بہت پریشان ہوں میرے اچھے دوست، میں اس ماحول سے
اکتا گیا ہوں، کہیں جانا چاہتا ہوں، کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہوں،

لیکن میں کہاں جاؤں کسی سے واقفیت ہی نہیں ہے۔ ہر طرف اجنبی ہی اجنبی
دکھائی دیتے ہیں۔"

"کیا میں بھی اجنبی ہوں . . . مسٹر ابوالفرحان؟"

"نہیں . . . نہیں . . . لیکن تمہی صاحب" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "پچھلی رات . . . وہ سب کیا تھا . . .
آپ نے اپنا خواب مجھے سنایا تھا . . . مجھے وہ عقاب والا خواب۔"

میں اسے متحیرانہ انداز میں دیکھتا رہا . . . میں سمجھا تھا شاید وہ میری
اور اپنی جنگ کا حوالہ دے رہا تھا۔ پھر اس ایک دن اور ایک رات کو
کس دنیا میں شمار کیا جائے۔

"فرحان صاحب . . . میں نے جو کچھ بھی آپ سے کہا تھا، اس میں
داستان طرازی کی رمق بھی نہیں تھی . . . لیکن آخر آپ اس سلسلے میں
اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

"میں کچھ نہیں بتا سکتا . . . کچھ بھی نہیں . . . اس قصے کو یہیں
ختم کیجیے۔"

"کیا میرے ساتھ میرے گاؤں چلنا پسند کریں گے؟" میں نے اپنے
لہجے کو خلوص کا بھرپور تاثر دیتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور . . . ضرور میرے دوست" وہ اٹھا اور پرجوش انداز
میں میرا شانہ دبا کر کہنے لگا۔ "یہاں تم میرے پہلے اور آخری دوست ہو،
میں ایک تنہائی پسند آدمی ہوں، لیکن نہ جانے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ

تم بھی میری تنہائی کا ایک جزو ہو۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔"

پھر وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ . . . مصری ملازم یا کاکے طورس وہی لذیذ مشروب لایا جو میں یہاں پہلے بھی پی چکا تھا۔

اس کے چہرے کی بشاشت کو ابوالفرحان کینہ توز نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ خود اس نے مشروب لینے سے انکار کر دیا تھا۔

جب میں اپنا پیالہ خالی کر چکا تو کاکے طورس نے ابوالفرحان والا پیالہ بھی میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کر کے دوسرا پیالہ قبول کیا تھا۔

میں نے ابوالفرحان کی آنکھوں میں کاکے طورس کے لئے شدید نفرت دیکھی۔

جب وہ چلا گیا تو ابوالفرحان نے مجھ سے کہا "یہ میرے لئے ضروری ہے، لیکن میں اس سے بے حد متنفر ہوں۔"

"مجھے تو اس سے خوف سا معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں!"

"پتہ نہیں کیوں، میں نے اکثر فلموں میں اسی کے سے جن دیکھے ہیں۔"

ایک خشک سی مسکراہٹ ابوالفرحان کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"تو آپ میرے گاؤں چل رہے ہیں؟" میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"یقیناً . . . !"

"اور آپ کا ملازم بھی ساتھ ہو گا؟"

"میں کہہ چکا ہوں کہ وہ میرے لئے بے حد ضروری ہے ویسے اگر میں چاہوں بھی کہ اُسے ساتھ نہ لے جاؤں تو اس میں کامیاب نہ ہو سکوں گا وہ دہاڑیں مار مار کر رو دے گا اور اپنا سر دیواروں سے ٹکرائے گا۔"

"بہت خوب۔" میں نے ہنس کر کہا "تو وہ بھی آپ کے نوادرات میں سے ہے۔"

"یہی سمجھ لو۔"

اس کے بعد ہم نے روانگی سے متعلق انتظامات کے بارے میں گفتگو کی تھی اور میں اپنے گھر واپس آ گیا تھا۔

میں نے اپنے یہاں کسی کو نہیں بتایا تھا کہ پُراسرار بڈھا بھی میرے ساتھ گاؤں جا رہا ہے۔

مقررہ وقت پر دونوں ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے اور ابوالفرحان نے میرا ٹکٹ بھی خرید لیا تھا۔

ہم دونوں سیکنڈ کلاس میں بیٹھے تھے اور کاکے طورس سرونٹس کلاس میں تھا۔

شام آہستہ آہستہ خوشگوار ہوتی جا رہی تھی، جب ہم قصبے کے اسٹیشن پر اترے سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور ہوا سرد ہو گئی تھی۔

شمال کی طرف سے اٹھنے والے سیاہ بادل خطرناک تھے، ایسے بادل

بے تحاشہ برسنے میں ابھی ہمیں مزید چھ میل کا سفر طے کرنا تھا۔ اسٹیشن سے گاؤں تک تانگوں اور بیل گاڑیوں سے جانا پڑتا تھا۔

اسٹیشن سے باہر نکلے تو میں اپنی بیل گاڑی وہاں دیکھ کر ایک بار پھر متحیر رہ گیا، ظاہر ہے کہ والد صاحب نے مجھے گاؤں بھیجنے کا فیصلہ فوری طور پر کیا تھا، گاؤں اطلاع نہ بھجوا سکے ہوں گے کہ میرے لئے اسٹیشن پر بیل گاڑی بھجوا دی جائے۔

گاڑی بان نے قریب پہنچ کر مجھے سلام کیا اور قلی کو سامان رکھنے کے متعلق ہدایات دیتا ہوا پھر گاڑی کی طرف واپس چلا گیا۔

بہرحال اب بیل گاڑی کا سفر شروع ہوا۔ شام بیحد خوشگوار تھی ڈوبے ہوئے سورج نے اپنے پیچھے شوخ رنگوں کے چمک دار لہریئے چھوڑ دیئے تھے جن کی چھوٹ درختوں کی چوٹیوں پر پڑ رہی تھی بسیرا لینے والے پرندوں کی تیز آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا۔

"میں کتنا خوش ہوں۔" دفعتہً ابوالفرحان نے ہنس کر کہا۔

"واقعی بڑا خوبصورت ماحول ہے۔"

"نجمی صاحب! اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے فضا میں تحلیل ہوا جا رہا ہوں!"

"خدارا خود کو روکیئے ورنہ ہم آپ کو کہاں تلاش کرتے پھریں گے۔" میں نے کہا اور وہ ہنس پڑا۔

بیج : مجھ اب اس کے چہرے پر غیر معمولی تازگی نظر آ رہی تھی آنکھوں

میں پچھلی چمک دوبارہ عود کر آئی تھی۔

میں نے کاکے طور سس کی طرف دیکھا، وہ پہلے ہی مجھے دیکھ رہا تھا نظر پڑتے ہی اس نے اپنی آنکھوں کو عجیب سی جنبش دی، اور میں نہ جانے کس طرح سمجھ گیا کہ وہ مجھے ابوالفرحان سے بے تکلف نہیں دیکھ سکتا۔ میں محتاط ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ابوالفرحان نے کہا "آپ اچانک خاموش کیوں ہو گئے نجمی صاحب"؟

"بیل گاڑی کا سفر مجھے جلد ہی تھکا دیتا ہے۔"

"مجھے تو بے حد لطف آ رہا ہے۔"

"محض اس لئے کہ بیل گاڑی آپ کی زندگی میں شامل نہیں ہے!"

آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا، کیونکہ شمال سے اٹھنے والی گھٹاؤں نے شفق کے سُرخ رنگوں پر یلغار کر دی تھی۔ گاڑی بان بیلوں کو تیز سے تیز تر چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا "فضول ہے! ان بے چاروں پہ ظلم نہ کرو۔ کہیں راستے میں بارش ہمیں آ لے گی۔"

"کھنکاہ تک پہنچنا ہی ہے سرکار۔" اس نے بیلوں کی دم اینٹھتے ہوئے کہا۔

اسٹیشن سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر راستے ہی میں ایک پرانی خانقاہ واقع تھی۔ گاڑی بان کا خیال تھا کہ وہاں پہنچ کر سفر ملتوی کر دیا

چاہیے۔

خانقاہ کبھی آباد رہی ہوگی، اب تو بالکل ویران پڑی تھی۔۔۔۔ اس راستے پر سفر کرنے والے وہاں رُک کر سستاتے ضرور تھے۔ ہم بھی وہاں کم ازکم بارش سے محفوظ رہتے۔

گاڑی بان کی جدوجہد جاری رہی، اسی دوران میں میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اسٹیشن کیوں آیا تھا۔

منشی جی نے بھیجا تھا سرکار۔۔۔ انہوں نے کہا تھا کہ مال گزاری لوٹنے کی خبر گئی ہے، میاں کسی نہ کسی کو ضرور بھیجیں گے۔۔۔!" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بیلوں کے ساتھ وہ خود بھی دوڑ رہا ہو۔ ابوالفرحان بھی اب کسی قدر فکر مند نظر آنے لگا تھا۔ بار بار سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔

خدا مہربان تھا کہ موسلا دھار بارش سے پہلے ہی ہم ویران خانقاہ تک پہنچ گئے۔ وہاں پہلے ہی سے ایک اور بیل گاڑی بھی موجود تھی۔ سائبان کے نیچے دو برقعہ پوش خواتین نظر آئیں۔ ان کے ساتھ ایک بزرگ صورت مرد بھی تھے، ان کا گاڑی بان سائبان کے ایک گوشہ میں آگ جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم نے اپنا سامان دوسری طرف کے سائبان میں آتا یا، معلوم نہیں کیوں ابوالفرحان بہت زیادہ بے چین نظر آنے لگا تھا، ذرا ہی دیر

میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بارش کی پیش روی کرنے لگے۔

کوندے کی لپک اور بادلوں کی گرج سے جنگل کا سناٹا مجروح ہونے لگا تھا۔

"بے حد خوفناک" دفعتہً ابوالفرحان بڑبڑایا۔

قدرت چاہتی ہے کہ آپ ہر اعتبار سے اپنی زندگی کی یکسانیت دور کر سکیں۔

"ایسی طوفانی راتوں سے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔"

ایک بار پھر زبردست کڑاکا ہوا اور پھر بارش شروع ہوگئی۔ میں نے اپنے بیگ سے ٹارچ نکالا اور کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں آگ جلائی جا سکتی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو۔" ابوالفرحان نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"آگ جلانے کے لئے جگہ۔"

"نہیں آگ جلانے کی ضرورت نہیں۔"

"تو کیا اندھیرے میں بیٹھے رہیں گے۔"

"ہاں یہی مناسب ہے۔"

میں مزید کچھ کہنے والا تھا کہ کسی نے میرا ہاتھ دبا دیا۔ یہ کاکے طور کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا جس نے اس طرح مجھے مزید گفتگو

کرنے سے روکا تھا۔ میں نے چپ سادھ لی۔
لیکن میرا دم گھٹنے لگا اور نہ جانے کیوں بار بار جی چاہتا تھا کہ عمارت کے
اس حصے میں جاؤں جہاں چار اجنبی اور بھی موجود تھے۔
انہوں نے وہاں آگ جلا رکھی تھی ادھر تو اندھیرے کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ
کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔
دفعتاً پھر کسی نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک جانب لے چلا۔ میں خاموشی
سے چلتا رہا۔ ایک جگہ میرا ہاتھ چھوڑ دیا گیا۔ ایسی صورت میں میرا رک جانا
غیر فطری نہیں تھا۔
میں نے قفل میں کنجی گھمانے کی آواز سنی اور پھر کوئی دروازہ چرچراہٹ
کے ساتھ کھلا، اب پھر میری کلائی مضبوطی سے پکڑ لی گئی۔
میں آگے بڑھا اور کچھ دیر چل کر میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز
سنی اور پھر یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے میرے چہرے کے قریب
بجلی کوندی ہو۔ میری آنکھیں بند ہوگئیں اور اسی لمحے میں نے سوختی
خوشبوؤں کا دھواں محسوس کیا اور بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔
اوہ . . . یہ تو وہی تہ خانہ تھا، جہاں میں نے اپنی ہزار ہا سال
پرانی لاش دیکھی تھی۔
تابوت اب بھی اپنی جگہ موجود تھا، اس کے قریب دو برقعہ پوش خواتین
نظر آئیں ان کے چہرے پوری طرح نقابوں میں پوشیدہ تھے۔ دونوں نے مل کر
تابوت کا ڈھکنا اٹھایا اور مجھے اس کے قریب پہنچنے کا اشارہ کر کے ایک طرف

ہٹ گئیں۔
جیسے ہی تابوت کے قریب پہنچا ایک نے جھک کر اوسیرس کی لاش کی
انگلی سے ایک انگشتری اتاری جس میں پون مربع انچ کا یاقوت جڑا ہوا تھا
اور میری طرف بڑھاتے ہوئے اشارہ کیا کہ میں اسے داہنے ہاتھ کی بیچ
والی انگلی میں پہن لوں۔
"یہ ناممکن ہے۔" دفعتاً پشت پر کوئی چیخا۔
میں بے ساختہ مڑا، سامنے ابوالفرحان کھڑا دہاڑ رہا تھا "میں سب
کو فنا کر دوں گا۔" پھر وہ میری طرف جھپٹا غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں
اس کی انگشتری پہنوں، لیکن میں نے اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی
انگشتری پہن لی، اس بار اس کی چیخ کسی مرتے ہوئے کتے کی آخری چیخ سے
مشابہ تھی، وہ جہاں تھا وہیں دھڑام سے فرش پر گر گیا، پھر اٹھ کر اس دروازے
کی طرف دوڑا جس سے اندر داخل ہوا تھا، ٹھیک اسی وقت ایک خاتون
نے کہا "یہ بچ کر نہ جانے پائے" اور میں بے تحاشہ اس کے پیچھے بھاگا۔
دروازہ کھلا ہوا تھا، اس سے گزرا ہی تھا کہ گھپ اندھیرے سے سابقہ پڑا۔
پیچھے مڑ کر دیکھا تب بھی اندھیرا ہی نظر آیا۔
ٹارچ روشن کی، لیکن دروازہ کہیں نہ دکھائی دیا جس سے گزر کر میں
باہر آیا تھا۔ سائبان کا وہ حصہ ویران پڑا تھا جہاں میں نے ابوالفرحان اور
کاکے طورس کو چھوڑا تھا، ان کا سامان بھی نہ دکھائی دیا، حتیٰ کہ گاڑی بان تک
غائب تھا۔

بڑی بھیانک رات تھی۔ میں ایک ایک کو آوازیں دے رہا تھا لیکن
جواب میں صرف بادلوں کی گرج یا جھکڑوں کے زور کے علاوہ اور کچھ
سنائی نہ دیتا۔

آخر میرا گاڑی بان کہاں غائب ہو گیا۔ . . ابوالفرحان اور کاکے طورس
جائیں جہنم میں۔

میں سائبان کے اس حصے کی طرف چل پڑا جہاں دوسرے مسافر مقیم تھے۔
یہاں کوئی بھی نہ دکھائی دیا، البتہ ان کے گاڑی بان کی جلائی ہوئی
آگ اب بھی محدود دائرے میں تھوڑی سی روشنی بکھیر رہی تھی۔

میں نے پھر ان لوگوں کو آوازیں دینی شروع کیں۔ حلق خشک ہو گیا
لیکن نتیجہ صفر۔

تھک ہار کر آگ کے قریب بیٹھ کر ہاتھ سینکنے لگا اچانک وہ انگشتری
یاد آئی جو تابوت والی لاش کی انگلی سے اتار کر میں نے پہن لی تھی، لیکن آنکھیں
پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود بھی مجھے انگشتری اپنی انگلی میں دکھائی نہ دی
. . . بوکھلا کر آگ کے پاس سے ہٹ گیا۔

کتنا بڑا یاقوت تھا! پہلے کبھی اتنا بڑا نگینہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا
تھا۔

تو پھر کیا وہ سب کچھ خواب تھا؟ اس شبے کو یقین کی صورت کیونکر
دے سکتا تھا، جب کہ پرانی خانقاہ کے سائبان پہ بارش قیامت ڈھا رہی
تھی اور میں کوسوں دور اس طوفانی رات کی بلاخیزیوں کا مقابلہ کر
رہا تھا۔

اگر وہ خواب تھا تو میں تنہا کیوں کھڑا تھا۔

اچانک ایک نئے قسم کا شور سنائی دیا، باد و باراں کے شور پہ بھی غالب
آ گیا تھا۔

ڈھول اور نفریوں کا شور . . . جیسے کوئی بہت بڑا جلوس اسی طرف
آ رہا ہو۔

اور پھر وہ جلوس بھی نظر آ گیا، دور تک مشعلیں ہی مشعلیں دکھائی دیتی
تھیں . . . مشعلیں بھی قریب آ گئیں، لیکن مشعل برداروں کا کہیں پتہ نہ
تھا، ایسا لگتا تھا کہ جیسے مشعلیں فضا میں معلق ہوں۔ فضا میں بڑا ڈراؤنا
منظر تھا، لیکن حیرت اس بات پہ تھی کہ میرے ذہن میں خوف کا شائبہ

تک نہیں تھا۔ جلوس کے وسط میں ایک تابوت نظر آیا . . . میرے خدایا یہ تو وہی تابوت تھا . . . اوسیرس کا تابوت جس میں پڑی ہوئی لاش کی انگلی سے میں نے یاقوت کی انگشتری اتار کر پہنی تھی۔ مشعلیں میرے قریب سے گزرتی ہوئی بائیں جانب مڑنے لگیں اور وہ تابوت مجھ سے آٹھ یا دس گز کے فاصلے پر آ ٹھہرا۔ وہ فضا میں معلق تھا، لیکن اس کی حرکت کے انداز سے ایسا ہی لگتا تھا جیسے اسے نظر نہ آنے والے افراد نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہو۔

تابوت کے رکتے ہی ڈھول اور نفیریاں خاموش ہو گئیں۔ اب صرف بادوباراں کا شور اندھیرے کی ہولناکیوں میں اضافہ کر رہا تھا۔

تابوت کا ڈھکنا خود بخود اٹھ رہا تھا . . . بارش پہلے ہی زور و شور کے ساتھ جاری تھی، لیکن مشعلیں تھیں کہ بجھنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔

میں بت کی طرح کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکنا پوری طرح اٹھ جانے کے بعد اچانک لاش بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنے ذہن کو ٹٹولا . . . کیا میں خائف ہوں . . . ہرگز نہیں . . . صرف تجسس . . . اب کیا ہو گا۔؟

دفعتاً قریب کی تین مشعلیں لاش پر جھک پڑیں اور لاش بھی دھڑا دھڑ جلنے لگی۔

پھر ایسا معلوم ہوا جیسے قیامت آگئی ہو . . . ایسا شور کہ مردے

بھی قبروں سے اٹھ کر کھڑے ہو جائیں۔ زمین دہل رہی تھی۔ خانقاہ کی ایک دیوار مجھ پر آ پڑی اور پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا . . . ؟

دوبارہ آنکھ کھلنے پر سب سے پہلے احساس ہوا تھا کہ میں کسی متحرک جگہ پر ہوں . . . تو کیا زمین بدستور ہل رہی ہے، لیکن ایسا شور تو نہیں تھا . . . اس کے برعکس بیشمار پرندوں کی لطیف اور نرم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں لیکن میں دیکھ نہیں سکتا۔

عجیب سی بدحواسی میرے ذہن پر طاری ہو گئی اور میں وحشیانہ انداز میں آنکھیں ملنے لگا۔

"کیا بات ہے . . . کیا ہوا ؟" کسی نے قریب ہی سے کہا۔

"تم کون ہو ؟"

"میں" ہنسی کے ساتھ کہا گیا "کیا آپ سو رہے ہیں نجمی صاحب۔ میں ابوالفرحان ہوں۔

"اوہو . . . ہم کہاں ہیں ؟"

"بیل گاڑی میں۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے !" ابوالفرحان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں دیکھ نہیں سکتا۔"

"کیوں مذاق کر رہے ہو ؟"

یقین کیجئے . . . ! خدایا میں کیا کروں . . . کیا میں بہت

زخمی ہوں۔ ۔ مجھ پر دیوار گری تھی ۔ ۔ ۔ خداوندا کیا اسی صدمے سے میری بینائی جاتی رہی ۔"

" آپ پتہ نہیں کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں ۔ ۔ کیسے زخم اور کیسی دیوار ۔ ۔ ۔ اور آنکھیں کھولیے ۔"

"تو کیا میری آنکھیں بند ہیں ۔"

ابوالفرحان قہقہہ لگا کر بولا " بہت زندہ دل آدمی ہیں آپ ۔ ۔ لیکن آپ یہ مذاق ختم کیجئے ۔"

پھر اچانک میری آنکھوں میں روشنی آگئی ۔ بیل گاڑی جنگل سے گذر رہی تھی اور صبح کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا ۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنا شروع کیا ۔ ابوالفرحان کے ملازم کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی ، لیکن ابوالفرحان کے چہرے پر تلخی کے آثار نظر آتے ۔

" ہم وہاں سے کب چلے تھے " میں نے ابوالفرحان سے پوچھا ۔

"بارش تھمتے ہی ۔ ۔ ۔ میں تو لعنت بھیجتا ہوں ایسی تفریح پہ ساری رات جاگتے گزر گئی ۔ آپ جیسے لوگ ہی اچھے ہوتے ہیں مجھے تو بیل گاڑی میں نیند نہیں آسکتی ۔"

" پتہ نہیں میں کن حالات سے دو چار ہوں " میں نے ان سنی کر کے کہا ۔

ابوالفرحان کے ملازم نے مجھے اس طرح گھورا جیسے میری زبان سے

کوئی نامناسب بات نکل گئی ہو ۔

لیکن اب تو نکل ہی چکی تھی ۔ ابوالفرحان بھڑک اٹھا ۔

" آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ۔ کیوں پریشان کر رہے ہیں ہم لوگوں کو کبھی دیوار گر رہی ہے آپ پر کبھی آپ اندھے ہو جاتے ہیں ، کیا ہمیں دہشت زدہ کرنے کے لئے یہاں لائے ہیں ؟"

" بڑی عجیب بات ہے ۔"

" خدارا خاموش رہیئے ۔ میں پہلے ہی بور ہوں " میں نے سکوت اختیار کیا ۔

بیل گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتی جا رہی تھی ۔ کچی سڑک دلدل میں تبدیل ہو گئی تھی ۔

ہمارا قصبہ اب زیادہ دور نہیں تھا ۔ جنگل سے نکل کر ہم ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہے تھے ۔

میں خود کو بہت تر و تازہ محسوس کر رہا تھا ۔ ایسا ہی لگتا تھا کہ جیسے پوری نیند لینے کے بعد بیدار ہوا ہوں ۔ اس کے برخلاف ان دونوں کے چہروں پر شب بیداری کے آثار دور سے بھی دیکھے جا سکتے تھے ۔

" بس ہم اب پہنچنے ہی والے ہیں " میں نے جنوب کی طرف دور تک نظر دوڑاتے ہوئے کہا ۔ بڑی مسجد کے مینارے دکھائی دینے لگے تھے ۔

ابوالفرسان کے چہرے پر کسی قدر توانائی کی جھلک نظر آئی اور وہ بھی جنوب
کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا ملازم بالکل بھُس بیٹھا رہا۔

"کاسکے طورس عجیب ہے۔" میں نے سوچا۔ میں نے سوچا ہی تھا کہ وہ
میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور سر کو اس طرح جنبش دی جیسے سب سمجھتا ہو۔

ٹھیک اسی وقت، مجھے مشعلوں کا جلوس یاد آیا۔ ادیبرس کی جلتی ہوئی
لاش آنکھوں میں بھر گئی اور میں اپنے داہنے ہاتھ کی بیچ والی انگلی میں
وزن سا محسوس کرنے لگا۔۔۔

یاقوت کی انگشتری یاد آئی۔۔۔ لیکن انگلی تو خالی تھی لیکن وزن
کا احساس بدستور تھا۔

میں نے دیکھا کہ ابوالفرحان میرے داہنے ہاتھ کو مسلسل گھورے جا
رہا ہے۔۔۔ مجھ سے نظر ملی تو میں نے اس کی آنکھوں میں خوف کی
جھلکیاں دیکھیں۔ کاسکے طورس مطمئن نظر آرہا تھا جیسے اُسے معلوم ہو گیا
کہ میں اپنی بیچ والی انگلی میں وزن محسوس کر رہا ہوں۔

قصبے میں پہنچ کر ابوالفرحان کی حالت بھی کسی قدر بہتر نظر آنے لگی
تھی۔ مہمانوں کا علم ہوتے ہی وہاں کے ملازمین غیر معمولی طور پر چاق وچوبند
ہو گئے۔ کاسکے طورس بہت مسرور تھا۔ ابوالفرحان سے گفتگو کرتے
وقت اس کے حلق سے چہکاریں سی نکلتیں اور میں ابوالفرحان کی
آنکھوں میں نفرت کی جھلکیاں دیکھتا، ناشتے کے بعد وہ دونوں سو گئے
تھے اور میں منشی جی سے حساب فہمی کرنے لگا تھا۔ آج ہی دو بجے تک

تحصیل میں "مال گزاری" جمع کرانی تھی۔

تحصیل کی عمارت قصبے سے چار میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ منشی جی
کی بجائے مجھے رقم لے کر جانی تھی۔ میرے ساتھ بیل گاڑی پر دو مسلح ملازمین
بھی بیٹھے تھے۔ ان کے پاس ایک نالی بندوقیں تھیں اور کارتوسوں کی
پیٹیاں سینوں میں آویزاں تھیں۔ وہ مجھ سے شہر کی باتیں پوچھ رہے
تھے اور میں اُڑے اُڑے سے ذہن کے ساتھ ان کے سوالات کے
جواب دے رہا تھا۔ اپنی اس ذہنی کیفیت کو میں کوئی معنے نہ پہنا سکا۔

آسمان بھی اب بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن حبس کی وجہ سے
موسم میں دلچسپی لینا کم از کم میرے بس سے باہر تھا۔ ایسی گھٹن تھی کہ
خُدا کی پناہ! ملازموں میں سے ایک نے سرسرے راہے شکار کی تجویز
پیش کی۔

"اگر ہم دو بجے سے پہلے تحصیل تک پہنچ سکیں تو مجھے کوئی اعتراض
نہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ میری دانست میں مہمانوں کے لئے شکار
کا گوشت نعمت غیر مترقبہ ہی ثابت ہوتا۔ پتہ نہیں کیوں، عام حالات
میں ابوالفرحان کے لئے میرے جذبات خوشگوار ہی تھے۔ وہ تو
جب کاسکے طورس کی طرف سے کوئی اشارہ ہوتا تو میں یہی محسوس
کرنے لگتا جیسے ابوالفرحان میرا دشمن ہو، بہر حال وہ میرا مہمان تھا۔۔۔
اور کاسکے طورس ہی کے اشارے پر میری دعوت خلوص بیکراں کی
شکل اختیار کر گئی تھی۔

ہمارا راستہ ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب سے گزرتا تھا۔ وہاں دونوں ملازمین نے پانچ بلیو برڈ شکار کیں۔ میں نے بھی ایک بندوق لے کر دو تین فائر کئے تھے، لیکن کچھ ہاتھ نہیں لگا تھا۔

پھر ہم تحصیل کی طرف چل پڑے۔

"شاید پھر بارش ہونے والی ہے۔" ایک ملازم بولا۔

"کچھ بھی ہو ہم چلتے رہیں گے۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ کام آج ہی ہونے والا ہے۔"

"وہ تو ہونا ہی ہے جناب، خواہ ندی نالے بہہ جائیں۔" جواب ملا۔

تحصیل تک بخیر و خوبی پہنچے تھے۔ میں نے رقم جمع کرائی اور بغیر تاخیر واپسی کے لئے روانہ ہو گئے، شاید مشکل سے دو میل گزرے ہوں گے کہ بارش آ گئی۔ اب ایسی کوئی جلدی بھی نہ تھی لہٰذا بیل گاڑی ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی کر دی گئی ہے۔

ڈھائی بجے تھے لیکن گہرے بادلوں نے مغرب کے وقت کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔

"آپ کچھ دیر آرام کر لیجئے۔" ایک ملازم نے مجھ سے کہا۔

لیکن میں اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے چونک پڑا کیونکہ میں نے اچانک اپنی انگلی میں یاقوت کی انگشتری کا وزن محسوس کیا تھا۔ بوکھلا کر ہاتھ پر نظر ڈالی۔ ۔ ۔ بڑا سا یاقوت بیچ کی انگلی پر جگمگا رہا تھا۔

میں نے اُسے دوسرے ہاتھ سے ڈھانکنے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ملازموں کو اس اچانک تبدیلی کا علم ہو۔

ملازم ۔ ۔ ۔ وہاں تو اب کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ ملازم، نہ بیل گاڑی، نہ وہ درخت ۔ ۔ ۔ حتیٰ کہ بارش بھی نہیں ہو رہی تھی۔

مطلع صاف تھا ۔ ۔ ۔ اس حد تک کہ سورج اپنا پڑوسی معلوم ہوتا تھا۔

چاروں طرف چٹیل میدان تھا اور جلتی ہوئی ریت کے ذرات مجھے جھلسائے دے رہے تھے۔

اچانک ایک جانب سے ایک قافلہ نمودار ہوا۔ اونٹوں کی قطار میری جانب آ رہی تھی۔ پھر بھی میں بیتابانہ انداز میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے دیکھا کہ انگشتری کے نگینے سے سرخ رنگ کی ایک کرن چھوٹ کر برق رفتاری سے قافلہ کی طرف بڑھتی چلی گئی ہے۔

پھر میں نے دیکھا کہ اونٹوں نے دوڑنا شروع کر دیا ہے، دیکھتے ہی دیکھتے قافلہ میرے قریب آ پہنچا۔

اور پھر ایک جماعت جو پروہتوں پر مشتمل تھی میری جانب بڑھی ان کے آگے ایک پروہت تھا جو بڑا سا عصا لئے چل رہا تھا۔

"کالکے طورس!" میری آواز بہت بلند تھی۔

"میرے آقا۔" وہ آگے بڑھ کر میرے قدموں پر جھکتا ہوا بولا۔

"نخلستان قریب ہی ہے۔ آپ اپنی عماری میں تشریف لے چلیے"
سارے پروہت سجدے میں پڑے ہوتے تھے۔ جب میں کاکے طورس
کے ساتھ آگے بڑھ گیا تو وہ بھی اٹھ کر میرے پیچھے چلنے لگا۔
ایک بلند و بالا اونٹ بٹھایا گیا جس پر زرتار عماری رکھی ہوئی تھی۔
عماری کے اندر قدم رکھتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے کسی ایئر کنڈیشنڈ
کمرے میں داخل ہوا ہوں۔

قافلہ پھر چل پڑا۔ . . میں بڑا سکون محسوس کر رہا تھا۔ مجھ پر
غنودگی طاری ہونے لگی اور میں نے اپنے ذہن کو فکر فردا سے آزاد
کر دیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو کاکے طورس عماری کا پردہ اٹھائے کہہ رہا
تھا "سفر ختم ہوا میرے آقا . . . میرے آقا اپنے خیمے میں تشریف
لے چلیے"

میں نیچے اتر آیا۔ دور تک خیمے ہی خیمے نصب تھے لیکن چاروں
طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ قافلے کے دوسرے اونٹوں کا بھی کہیں
پتہ نہ تھا، اب جو میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہاں کاکے طورس
کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں۔

میں خاموشی سے ایک طرف چلنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کس
خیمے میں داخل ہونا ہے، لیکن پھر بھی میں جس خیمے کے سامنے رکا تھا
کاکے طورس نے آگے بڑھ کر اس کا پردہ اٹھایا۔

اور شاید یہی میرے لیے مخصوص تھا۔ . . اسے شاہانہ انداز میں سجایا
گیا تھا جیسے ہی میں تخت پر بیٹھا ڈھول اور نفیریوں کی آواز سے فضا
گونج اٹھی اور تین پجاری خیمے میں داخل ہو کر سجدے میں گر پڑے۔
کاکے طورس تخت کی بائیں جانب کھڑا تھا۔

"انہیں اٹھا کر سیدھا کھڑا کر دو" میں نے اس سے کہا۔

"میرے آقا . . . یہ تو اس وقت تک سجدے ہی میں پڑے رہیں
گے جب تک اس تخت پر" وہ جملہ پورا کیے بغیر خاموش ہو گیا۔
غالباً وہ کہنا چاہتا تھا کہ جب تک میں تخت پر بیٹھا ہوا ہوں وہ
سجدے ہی میں پڑے رہیں گے۔

"میری بات سن" کاکے طورس" میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔
"میری روح پرانے جسم میں واپس نہیں آئی . . . اب میں دیوتا نہیں
آدمی ہوں . . . اور کسی بھی آدمی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے آدمی
سے خود کو سجدہ کرائے"

"میں بڑی عجیب بات سن رہا ہوں میرے آقا" اس کے لہجے
میں حیرت تھی۔

"میں نئے جسم میں آیا ہوں . . . نہ آتا . . . لیکن ان دو آنکھوں
کی تلاش مجھے لائی ہے۔ وہ دو آنکھیں جو تیری معبود ہیں"

"اور وہ دو آنکھیں پرانے ہی جسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرے
آقا۔" کاکے طورس نے مغموم لہجے میں کہا۔

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

"نئے جسم کی دسترس سے باہر ہیں پُرانی آنکھیں۔"

"مجھے اس کے تابوت تک پہنچا دے کاکے طورس۔"

"ابھی یہ ناممکن ہے میرے آقا۔"

"کاکے طورس . . ."

"میرے آقا۔" وہ خوف سے کانپنے لگا۔

میں نے انگشتری کے نگینے پر نظر ڈالی۔ اس سے تین شعاعیں پھوٹ کر ان تینوں پجاریوں کے سروں سے ٹکرائیں، جو سجدے میں پڑے ہوتے تھے وہ اٹھے تھے اور زخمی جانوروں کی طرح چلاتے ہوئے خیمے سے باہر نکل گئے تھے۔

کاکے طورس گڑگڑانے لگا۔ "رحم . . . رحم . . . میرے آقا . . ."

"ان سے کہہ دے کہ آئندہ مجھے سجدہ نہ کریں۔" میں نے غضبناک ہوکر کہا۔

"بہت بہتر میرے آقا۔"

اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"ادھر میرے قدموں میں بیٹھ جا۔"

اس نے خاموشی سے تعمیل کی۔ نگینے سے پھر ایک کرن پھوٹی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کے سر سے گزر کر میرے جسم میں سرایت کر گئی ہو۔

وہ چیخ مار کر اٹھ کھڑا ہوا . . . ایسی دہشت ناک چیخ میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

"میرے آقا . . . !"

"کیوں . . . کیا ہوا . . ." میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"مم . . . میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ ربہ آئیس آپ کی دسترس سے باہر ہیں۔"

"پھر تو کیا کہنا چاہتا ہے۔"

"تائیفن کا لہو چاہیئے . . . اس کے لئے . . . !"

"لہو . . ." میں دم بخود رہ گیا . . . شاید اس نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ میری زبان پھر اس خواہش کا اعادہ نہ کر سکے۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے، دفعتاً وہ بولا "تائیفن کا لہو اس آگ کو ٹھنڈا کر دے گا جس میں وہ زندگی بھر جلتی رہی تھی۔ وہ آگ تو اب بھی اس کے گرد رقص کر رہی ہے !"

"تائیفن . . ." میں نے طویل سانس لی، چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔ "اچھا مجھے تائیفن تک پہنچا دے۔"

"میں کس طرح پہنچا دوں میرے آقا . . . میری قوت محدود ہے۔"

"پھر میں اس جگہ کیوں موجود ہوں . . . مجھے یہاں کون لایا ہے . . . میں اوسیرس کا ہمشکل ہو سکتا ہوں۔ لیکن اوسیرس ہرگز نہیں ہوں . . . تناسخ میرا ایمان نہیں ہے . . . میں مسلمان ہوں۔"

"یہی تو سب سے بڑی دشواری ہے میرے آقا۔۔۔ تم ایسی قوم میں پیدا ہوئے ہو کہ۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سلسلے میں اظہار خیال کے لئے کس قسم کے الفاظ منتخب کر دوں۔"

"اچھا۔۔۔ میرے آقا اٹھیئے۔۔۔ میں آپ پر وہ راز منکشف کروں گا جو آپ کے پرانے جسم ہی کے ساتھ نذر آتش ہو گیا۔"

میں اُٹھ گیا۔۔ کاکے طورس۔۔۔ بائیں جانب ہٹتا ہوا خیمے کے دروازے سے جا لگا تھا، اچانک اس نے میری انگشتری کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ کائنات کا دل ہے میرے آقا۔۔۔!"

"کیا یہ۔۔۔ نگینہ۔۔۔!" میں نے پون مربع انچ کے یاقوت کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں میرے مالک۔۔۔!۔۔۔ ذرا غور سے دیکھئے، اس پر سے نظر نہ ہٹایئے۔"

میں نے اس کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے نگینے پر نظر جما دی اور میں نے دیکھا کہ میں ابوالفرحان کے ساتھ رات کے کھانے کی میز پر موجود ہوں اور شکار کی ہوئی بلیو برڈ مسلم روسٹ کی ہوئی ہمارے سامنے رکھی ہیں۔

"کھایئے۔ مسٹر ابوالفرحان۔" میں اس سے کہہ رہا تھا "شاید آپ نے یہ پرند کبھی نہ کھایا ہو۔"

ہاں۔۔۔ تجمی صاحب! واقعی بہت لذیذ ہے۔۔۔ ساری دوپہر میں سوتا رہا تھا۔ اس طرح اس قابل ہو سکا ہوں کہ اس کی مخصوص لذت سے

لطف اندوز ہو سکوں۔

"میری آنکھ تو پل بھر کے لئے بھی نہیں لگی۔" میں نے کہا۔

اس پر وہ ہنس پڑا اور بولا "آپ ساری رات سوتے رہے تھے۔ پرانی خانقاہ میں بھی اور بیل گاڑی پر بھی۔ میرا تو خیال ہے کہ تحصیل والے سفر کے دوران بھی سوتے رہے ہوں گے۔۔۔ آپ جیسا سونے والا آج تک کوئی دوسرا میری نظر سے نہیں گزرا۔"

میں نے چونک کر نگینے سے نظر ہٹانی چاہی لیکن اب میرا ہاتھ خالی تھا اور میں سچ مچ ابوالفرحان کے ساتھ کھانے کی میز پر تھا۔

"کک۔۔۔ کاکے!" ہکلاتے ہکلاتے سنبھل کر میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔۔۔ یہ قصبے والی حویلی ہی کا کمرہ تھا اور ہم کھانا کھا رہے تھے اور دونوں ملازمین میز کے قریب ہی کھڑے میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ کاکے طورس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

"آپ کے ملازم نے کھانا نہیں کھایا۔۔۔!" میں نے اڑتے ہوئے ذہن کے ساتھ ابوالفرحان سے کہا۔

وہ ملازموں کے ساتھ کھائے گا۔۔۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ میرے ملازم سے اتنی دلچسپی کیوں لیتے ہیں۔"

"بڑا عجیب چہرہ ہے۔"

"میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ مصر کے قدیم پجاریوں کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔"

پھر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے اسی کمرے میں قہوہ پیا... ابوالفرحان اس کا عادی تھا اور اس کے ملازم ہی نے اس کی تیاری میں باورچی کی مدد کی تھی۔ قہوہ لذیذ تھا... لیکن میرا ذہن... اس وقت اس سے لطف اندوز ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

وہ زرنگار خیمہ کہاں گیا، جہاں کاکے طورس نے مجھے انگشتری کے نگینے پر نظر جمانے کو کہا تھا... دفعتاً کاکے طورس کمرے میں داخل ہوا۔ میرا منہ حیرت سے کھلا ہی تھا کہ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔

مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی... !... اور وہ کاکے طورس ہی کی آواز تھی۔

"نجمی... یہ نہ بھولو کہ یہاں اس کمرے میں تم صرف نجمی ہو!"

میں نے بھی کچھ کہنا چاہا تھا... لیکن میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

اندھیرا اسی طرح روشنی میں تبدیل ہوا تھا جیسے کسی فلم کا منظر "فیڈ ان" ہوتا ہے۔ اب نہ وہ کمرہ تھا اور نہ وہ لوگ... بس ایک چہرہ... کاکے طورس کا آنکھوں کے سامنے تھا اور میں اسی خیمے میں تھا۔ جہاں کاکے طورس نے میری انگلی میں جگمگاتے ہوئے بڑے سے یاقوت کو کائنات کا دل کہا تھا۔

"یہ کائنات کا دل ہے میرے آقا... ابھی آپ نے کیا دیکھا؟"

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"تمہارے بنائے ہوئے قہوہ کی مٹھاس اب بھی میری زبان پر موجود ہے... !" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"قہوہ" وہ حیرت سے بولا "لیکن... میں نے تو آج تک قہوہ

نہیں بنایا میرے آقا۔"

"کیا تم ابوالفرحان کے ملازم نہیں ہو؟"

"بڑا عجیب سا نام لیا ہے آپ نے۔ میرے لئے بالکل نیا ہے۔۔۔"

"اچھا خاموش رہو۔۔۔" مجھے پھر طیش آ گیا۔

"میرے آقا۔۔۔" اس نے سہم کر سر جھکا لیا۔

خیمے میں عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ خوابناک سا ماحول تھا۔

معلوم نہیں کیوں کاکے طورس کی موجودگی مجھے بُری طرح کھلنے لگی تھی۔ میں تنہائی چاہتا تھا۔۔۔ لیکن کیوں مجھے معلوم نہیں۔

دفعتاً یاقوت کے نگینے پر دوبارہ نظر پڑی اور آنکھوں کے سامنے پھر دھند چھانے لگی۔۔۔ ذرا ہی دیر میں نہ وہ خیمہ تھا۔۔۔ اور نہ کاکے طورس کی موجودگی مجھے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔

میں نے خود کو ایک پتھریلے راستے پر پایا۔ یہ ایک تنگ سا درّہ تھا جس کی دونوں جانب اونچی اونچی چٹانوں کے سلسلے تھے۔

میں تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے سینکڑوں میل پیدل طے کئے ہوں۔ لباس تار تار تھا۔۔۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔

اچانک میں چلتے چلتے گر پڑا۔ آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ پتھریلی زمین پر گرا تھا لیکن چوٹ کا احساس ذرّہ برابر نہ تھا۔

پیاس کتنی شدید پیاس تھی۔ قریب ہی سے ایسی آواز آ رہی تھی

جیسے بلندی سے پانی گر رہا ہو۔۔۔ اور شاید یہی آواز مجھے یہاں تک لائی تھی، لیکن اب مجھ میں ہلنے کی سکت بھی نہ رہی تھی۔

ذرا دیر کو مجھ پر غشی طاری ہوئی، اس کے بعد میں اٹھا تھا اور مشینی طور پر چلنا شروع کر دیا تھا۔

پانی گرنے کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ دن کا اجالا دھندلکے میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

میرے اوپر کی چٹانوں کا سلسلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ دھندلکا بھی تاریکی میں مدغم ہو گیا۔

اب میں اپنے چہرے پر پانی کی ٹھنڈی سی پھواریں پڑتی محسوس کر رہا تھا۔

قریب ہی کہیں اندھیرے میں کسی چٹان پر پانی کی دھار گر رہی تھی۔

میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر آہستہ آہستہ آگے کھسکنے لگا۔ یہاں اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

اچانک میرے دونوں ہاتھ تیزی سے بہتے ہوئے پانی میں جا پڑے اور میں جہاں تھا وہیں رک گیا۔

پھر میں نے کسی پیاسے پرندے کی طرح اپنی پیاس بجھائی۔

میں زمین پر اوندھا پڑا تھا اور میرا چہرہ کانوں تک پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس کے بعد مجھے علم نہیں کہ میں بے ہوش ہوگیا تھا یا وہ اسی غار کی تاریکی تھی جو میرے اعصاب پر بھی طاری ہوگئی تھی۔

پتہ نہیں کتنی دیر تک میں اس حال میں رہا۔۔۔ لیکن وہ آواز۔۔۔ کتنی سریلی تھی جو پہلی بار میری سماعت سے دو چار ہوئی تھی۔۔ کسی عورت کی آواز۔۔۔ ایسی۔۔۔ مترنم آواز۔۔۔ شاید اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی۔

اے سحر اعظم۔۔۔ اے میرے افعی۔۔۔ تجھے روشنی کے مالک رگ کو ڈسنا ہے۔۔۔ رگ جو دیوتاؤں کی مجلس کا صدر نشین ہے۔۔۔ رگ جو اسم اعظم کو اپنے سینے میں اسی طرح مخفی رکھتا ہے جیسے آنکھ میں نظر۔۔۔ اے میرے افعی اگر تیرا وار خالی گیا تو میں تجھے ہمیشہ کے لئے تاریکی میں سلا دوں گی۔۔۔ ہوشیار کہ روشنی کا مالک عنقریب ادھر سے گزرے گا۔۔۔ ہوشیار اے میرے افعی ہوشیار۔۔۔!"

اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ میرا دل کھوپڑی میں دھڑک رہا تھا۔

میں نے اٹھنا چاہا۔۔۔ لیکن میرے ہاتھ کہاں تھے۔۔۔ جنھیں زمین پر ٹیک کر اٹھ سکتا۔۔۔ اور۔۔۔ میرے پیر۔۔۔ کہاں گئے۔۔۔ میرے پیر۔

میں تو لہریں لیتا ہوا رینگ رہا تھا۔۔۔ خداوندا۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ میں تو ایک بہت بڑا سانپ تھا۔

تیز رو چشمے کو میں نے تیر کر پار کیا۔۔۔ اب میں روشنی میں تھا، چاروں طرف بے آب و گیا چٹانیں بکھری ہوئی تھیں اور وہ چشمہ بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا جس سے گزر کر میں یہاں تک پہنچا تھا۔

دھوپ بہت تیز تھی اور چٹانیں بُری طرح تپ رہی تھیں۔ میں کسی سایہ دار جگہ کی تلاش میں بھٹکتا رہا حتیٰ کہ شام ہوگئی اور میں ایک چٹان سے لگ کر پڑ رہا۔

میں سوچ سکتا تھا۔ لیکن قوت گویائی سے محروم ہوگیا تھا۔ پھر شفق کی سرخیاں تاریکی میں بدلنے لگیں اور اندھیری رات مجھ بے دست و پا پر پہاڑ کی طرح ٹوٹ پڑی۔

کچھ دیر بعد بھوک کی شدت سے نڈھال ہوکر میں نے پھر رینگنا شروع کر دیا۔

سامنے کی ڈھلان سے اتر کر میں آگے بڑھتا رہا۔ دفعتہً کسی قدر فاصلے پر مدھم سی روشنی نظر آئی۔۔۔ پہلے تو میں ٹھٹکا پھر میری رفتار خاصی تیز ہوگئی۔ پھر میں اسی جگہ پہنچ گیا، جہاں ایک بڑے سے سنگی پیالے میں کافوری شمع روشن تھی اور شمع کے پس منظر میں کاکے طورن کا پراسرار چہرہ تھا۔

میں غصے سے بل کھانے لگا۔۔۔ پھن کاڑھ کر اتنا اٹھا کہ اس کے چہرے کے مقابل آگیا۔

"مم۔۔۔ میرے آقا۔۔۔ رحم۔۔۔ رحم" وہ چیخنے لگا۔

"رحم کے نیچے میں اس حال کو کیوں کر پہنچا؟" میں جھلاہٹ میں یہی ایک جملہ سوچ سکا تھا۔

لیکن فوراً ہی کاکے طورس سے مجھے اس کا جواب مل گیا۔

آپ ربہ آتیس کے سحرِ اعظم میں تبدیل ہو گئے ہیں میرے آقا۔۔۔ یہ سحر ایسا تھا کہ سورج دیوتا۔ رع سے بھی اس کی کاٹ نہیں ہو سکی تھی۔

یہ بکواس میری سمجھ میں نہیں آتی۔" میں نے سوچا

تمہارے بعد۔۔۔ میرے آقا۔۔۔ تمہارے بچاری۔۔۔۔ روشنی کے مالک نے تمہارے بیٹے ہورس کو اپنی بادشاہت میں شریک کیا اور سارے دیوتاؤں پر حکومت کرنے لگا۔۔۔ ربہ آتیس اس کی قوت کا راز معلوم کرنا چاہتی تھی۔۔۔ وہ اس کا وہ نام معلوم کرنا چاہتی تھی جو طاقت کا سرچشمہ تھا، اس کے لئے اس نے ایک سحر ترتیب دیا۔۔۔ اور اے میرے آقا وہ طلسمی سانپ تھا جس نے روشنی کے مالک رع کو ڈس لیا۔۔۔ اور پھر جب تک ربہ آتیس کو اپنا اسم اعظم نہیں بتا دیا تھا وہ جان لیوا اذیت میں مبتلا رہا تھا۔۔۔ اس سے سحر ٹوٹ نہیں سکتا تھا، سانپ ربہ آتیس کی قوت کی علامت ہے میرے آقا۔"

"لیکن اس نے مجھے اس جسد کریہہ میں کیوں مقید کر دیا ہے؟" میں نے سوچا اور کاکے طورس کے ہونٹ ہلے۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا۔۔۔۔

"تم اپنی اصل ہیئت میں اس چشمے کو پار نہ کر سکتے تھے۔۔۔۔ میرے آقا۔۔۔"

اسے تو میں کب کا پار کر چکا تھا۔۔۔ میں نے گرم دماغی کے ساتھ سوچا۔

راہ دشوار گزار ہے میرے آقا۔۔۔ پیروں سے طے نہیں ہو سکے گی۔۔۔"

"کہاں کی راہ۔۔۔!" میں نے سوچا۔

ربہ آتیس کی آخری آرام گاہ کا سفر درپیش ہے آپ کو اے میرے آقا!"

"اچھا اب بکواس بند کرو۔۔۔ میں بھوکا ہوں!"

میری اس ذہنی ترسیل کے جواب میں اس نے سنگِ سماق کا ایک بڑا سا پیالہ میرے آگے رکھ دیا جس میں تازہ گوشت کے ٹکڑے تھے۔

پیٹ کی آگ بجھتے ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ چراغ کی لو مدغم ہوتی جا رہی تھی اور اس کے پس منظر میں کاکے طورس کا چہرہ بھی کہر آلود ہوتا جا رہا تھا۔

سورج کی پہلی کرن ہی شاید میری بیداری کا باعث بنی تھی میں اٹھ بیٹھا۔۔۔ اپنے ہاتھ پیروں سمیت۔ میں اب سانپ نہیں تھا جس چٹان پر میں اس وقت بیٹھا ہوا تھا، اس کے نشیب میں بے شمار لوگ سوتے نظر آئے۔

سورج نے ابھی ابھی مشرق سے سر ابھارا تھا۔ سرسبز چٹانیں پرندوں کے شور سے گونج رہی تھیں۔ وہ کوئی قافلہ تھا جو اس طرح کھلے میدان میں سو رہا تھا۔ میں نے سوچا کیا ان کے پاس خیمے نہیں ہیں۔ ساتھ ہی مجھے شدید سردی کا احساس بھی ہوا۔ ٹھیک اسی وقت ایک آدمی پر نظر پڑی جو گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اسی چٹان کے اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسی دوران میں میری نظر اُس یاقوت پر پڑی جو میری انگلی میں جگمگا رہا تھا، پتہ نہیں کیوں فوری طور پر مجھے احساس ہوا کہ جیسے میں بہت طاقتور ہوں، اگر وہ پورا قافلہ بھی میرا مخالف ہو گیا تو میں اسے پیس کر رکھ دوں گا۔

آنے والا مجھ تک پہنچ چکا تھا اور وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا ۔ ۔ ۔

"سکاکے طورس ۔ ۔ ۔" میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

"میرے آقا ۔ ۔ ۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا اور مایوسی سے اس طرف ہاتھ اٹھا دیئے، جہاں قافلہ سویا پڑا تھا۔

"یہ لوگ کون ہیں ؟"

مردے ۔ ۔ ۔ مار گزیدہ ۔ ۔ ۔ یہ سانپوں کی وادی ہے میرے آقا ۔ ۔ ۔ یہ ربۃ آتیس کے ہیکل کے زائر تھے، ایک رات انہوں نے غلطی سے یہاں پڑاؤ کیا اور سب کے سب ڈسے گئے !"

"یہ تو بڑی ۔ ۔ ۔ بُری خبر سنائی تم نے ۔"

"ان کی خوش نصیبی آپ کو ادھر لائی ہے میرے مالک ۔"

"تو کیا کہنا چاہتا ہے ۔"

"آپ انہیں دوبارہ زندگی بخش سکتے ہیں ۔"

"بکواس ۔ ۔ ۔ !"

"ہاں میرے مالک ۔ ۔ ۔ بظاہر بکواس ہے لیکن سورج کی طرح روشن حقیقت !"

"مجھے الجھن میں نہ ڈال سکاکے طورس !"

"کل آپ کیا تھے میرے آقا ؟"

"سس ۔ ۔ ۔ سانپ !"

سورج دیوتا رع کو ربۃ آتیس کے سحر اعظم نے سانپ بن کر ڈسا تھا ۔ ۔ ۔ اور دیوتا رع کو اپنا اسم اعظم ربۃ آتیس پر ظاہر کرنا پڑا تھا ۔ ۔ ۔ تب اسم اعظم مار گزیدگی کا علاج قرار پایا تھا ۔ ۔ ۔ یاد کیجئے آقا ۔ ۔ ۔ !"

"میں یاد کر دوں ؟"

"اسم اعظم ۔ ۔ ۔ !"

"کیا تو نشے میں ہے سکاکے طورس ۔" میں نے کہا اور دفعتہً میری نظر یاقوت کی انگشتری پر پڑی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے سرخ نگینہ پھیلاؤ اختیار کر رہا ہو ۔ ۔ ۔ اور مجھے اس میں ایک جانی پہچانی سی شکل نظر آئی۔

"اوہو ۔ ۔ ۔ یہ تو وہی تھی ۔ ۔ ۔ آتیس ۔ ۔ ۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے ۔ ۔ ۔ میرے کانوں نے صاف سنا !"

"ہاپی رعھورس ۔"

"ہاپی رعھورس" میں نے دہرا دیا۔

اس کے بعد ایک بار پھر آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ دھند چھٹی تو سکاکے طورس کا مسکین چہرہ نظر آیا، اس کے ہونٹ بھی ہل رہے تھے۔

"میرے آقا۔۔۔ میرے آقا۔۔۔ سورج بلند ہو گیا تو دشوار ی ہو گی اس سے پہلے ہی انہیں زندہ کر دیجیے۔"

میں نے پھر یاقوت کی انگشتری پر نظر ڈالی۔ نگینے سے بے شمار کرنیں چھوٹ رہی تھیں، اس کے بعد میں نے جو کچھ بھی کیا اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔

میں اسی چٹان پر تن کر کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھ نیچے وادی پر پھیلا دیئے۔

میرے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ "ہاپی رعھورس۔۔۔ ہاپی رعھورس۔"

پھر میں نے دیکھا کہ ڈھلان میں پڑے ہوئے مردہ اجسام متحرک ہو گئے ہیں، کوئی بیٹھا آنکھیں مل رہا ہے۔۔۔ تو کوئی انگڑائی لے رہا تھا۔۔۔ باربرداری کے مردہ جانور بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

یکایک پوری وادی عجیب سے شور سے گونجنے لگی۔۔۔ اور کاکےطورس نے مجھے بتایا کہ وہ آتیسس کے ہیکل میں بڑی بڑی قربانیاں دینے کی قسمیں کھا رہے ہیں!

"اب یہ لوگ۔۔۔ کیا کریں گے؟"

"ان کا سفر پھر شروع ہو جائے گا میرے آقا۔۔۔ ہم بھی ان کے ساتھ ہی چلیں گے اور ان پر ہم ظاہر نہ کریں گے کہ ہم کون ہیں؟"

"ہم کون ہیں۔۔۔ اے عجیب آدمی؟"

"ہیکل تک پہنچنے سے قبل ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔۔۔ میرے آقا۔۔۔ لیکن ہم پھر بھی بہت کچھ ہوں گے۔"

وہ خاموش ہو کر مسکرایا۔۔۔ مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔۔۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ مزید کوئی خاص بات کہتے کہتے رک گیا ہو۔۔۔

لیکن جلد ہی میری توجہ اس کی طرف سے ہٹ گئی کیونکہ دوبارہ زندگی پانے والے شور مچاتے ہوئے اسی چٹان پر چڑھے آ رہے تھے جس پر ہم دونوں کھڑے تھے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ان کے پیچھے چھوٹے بڑے لاتعداد سانپوں کا سیلاب سا امنڈ رہا تھا۔۔۔ وہ ان کا پیچھا کر رہے تھے۔۔۔ لیکن سب اس طرح آپس میں گڈ مڈ ہو گئے تھے ایک دوسرے سے الجھ کر جہاں تہاں رہ جاتے تھے۔۔۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ڈھلان کے اختتام سے سمندر کی کوئی بڑی سی طوفانی لہر اٹھ اٹھ کر چٹان سے ٹکرا رہی ہو۔

اچانک پھر یاقوت کے نگینے سے سُرخ رنگ کی کرن پھوٹی اور بجلی کے کڑاکے کی سی آواز کے ساتھ ان لاتعداد سانپوں پر ٹوٹ پڑی۔

ایک شورِ قیامت تھا جس نے پوری وادی پر یلغار کر دی تھی۔ اس میں ان لوگوں کی آوازیں شامل تھیں، جو اب اس چٹان پر پہنچ کر دور تک پھیل گئے تھے۔

سانپوں کے جلنے اور جھلسنے سے فضا میں عجیب سی بدبو منتشر ہو

رہی تھی اور کاکے طورس دونوں ہاتھوں سے سینہ دباتے بُری طرح کھانس رہا تھا۔ ایسا ہی کچھ حال سب کا نظر آیا . . . لیکن میں سینے کی گھٹن سے محفوظ تھا۔

تھوڑی دیر بعد مغرب سے تیز ہوا کے جھکّڑ چلنے لگے اور انہوں نے اتنی شدت اختیار کی کہ طوفان کا گمان ہونے لگا۔ میرے سوا اور سب زمین پر اوندھے پڑے تھے۔ کاکے طورس بھی اسی حال میں تھا اور بآوازِ بلند دیوتاؤں کو پکار رہا تھا۔

لیکن وہ طوفانِ باد مجھے ہلا بھی نہ سکا . . . میں پہلے ہی کی طرح تنا کھڑا تھا۔

خُدا خُدا کر کے وہ بلا بھی ٹلی اور وادی پر پہلے ہی کا سا سکون طاری ہو گیا۔ گوشت جلنے کی بدبو سے فضا پاک ہو گئی تھی اور وہ جلے ہوئے سانپ بھی کہیں نظر نہ آتے۔

قافلے والے آہستہ آہستہ میرے گرد اکٹھا ہو رہے تھے، ان کی آنکھوں میں میرے لئے عقیدت تھی۔

کاکے طورس میرے پیچھے مؤدب کھڑا تھا . . . اچانک قافلے والوں میں سے ایک بوڑھا آدمی آگے بڑھا۔

"اے معزز آدمی . . ." اس نے کسی قدر جھک کر مجھ سے کہا۔

"تم تو ہمارے ساتھ نہ تھے۔"

"اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔" میری زبان سے غیرارادی طور پر

نکلا۔

"لیکن ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ ہمیں دوبارہ زندگی عطا کرنے والا کون ہے؟"

میں نے جواب میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔

وہ سب سورج دیوتا کی ثنا کرنے لگے اور میں دل ہی دل میں لاحول پڑھنے لگا۔

ساتھ ہی مجھے "ہاپی رعہورس" کا خیال آیا . . . یہ کیا بکواس تھی . . . اور یہ بے معنی الفاظ کیوں میرے ذہن میں آتے تھے . . . اور انہوں نے کس طرح مردوں میں جان ڈال دی تھی۔

مصری دیو مالا میں دریائے نیل کا ذکر بھی دیوتا کی حیثیت سے ملتا ہے، اور وہ دیوتا ہاپی کہلاتا تھا . . . "رعہورس" رع اور ہورس کا مرکب ہو سکتا ہے، کیوں کہ اوسیرس کے بعد اس کے بیٹے ہورس کے پیرو رع کے ماننے والوں میں مل جل گئے تھے اور دریائے نیل ان کے لئے جان بخش بھی تھا اور تباہ کن بھی۔ جب اس میں سیلاب آتا تو بستیوں کی بستیاں غرقاب ہو جاتیں . . . اور جب پانی اترتا تو اس کے کنارے لہلہاتے ہوئے کھیت زندگی سے بھرپور انگڑائیاں لینے لگتے۔

"جہنم میں جائے سب کچھ!" میں آہستہ سے بڑبڑایا . . . "میں یعنی نجمی . . . بیسویں صدی میں سانس لینے والا ہزاروں سال پرانے

اس شیطانی چکر میں پھنس گیا۔"

"میرے آقا . . . بس اب زبان سے کچھ نہ نکلے . . ." کاکے طورس نے تیز تبسم کی سرگوشی کی اور میں چونک پڑا۔

بوڑھا آدمی خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا، اچانک وہ گھٹنوں کے بل گر گیا اور گڑگڑانے لگا۔ "اے دیوتاؤں کے ہرکارے . . . ہماری تعظیم قبول کر . . . ہم خوش نصیب ہیں کہ تم ہمارے سروں پر سایہ فگن ہوا . . . اب ہم اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے۔"

کاکے طورس گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا . . . اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

"بائیں جانب کی ڈھلان میں جہاں تم نے اپنے خیمے نصب کئے تھے . . . تمہارے بار برداری کے جانور زندہ سلامت موجود ہیں . . . جاؤ . . . وہیں جاؤ . . . اور میرے آقا کا انتظار کرو . . . یہ سچ ہے کہ اب تم منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے . . . بڑی شان والی نے میرے آقا کو تمہاری رہنمائی کے لئے بھیجا ہے . . . جاؤ اس کے خیر مقدم کی تیاری کرو۔"

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ سب وادی میں اتر رہے ہیں . . . کاکے طورس ان سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا . . . "بے خطر زمین پر پاؤں رکھو . . . اب یہ سانپوں کی وادی نہیں کہلائے گی . . . بڑی شان والی نے ان کا خاتمہ کر دیا۔"

قافلے والوں نے آئیسن کے نام کے جے کارے لگائے اور وادی میں اترتے رہے۔

اب پھر ہم دونوں اس بلند مقام پر تنہا رہ گئے تھے . . . "یہ سب کیا ہے کاکے طورس؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"کائنات کے دل سے پوچھئے میرے آقا . . . میں کچھ بھی نہیں جانتا۔" یہ کاکے طورس کا جواب تھا۔

میں نے یاقوت کے نگینے پر نظر ڈالی . . . لیکن اب وہ بالکل سپاٹ دکھائی دیتا تھا، نہ اس سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور نہ کوئی تبدیلی اس میں ہوئی تھی۔

میں نے کاکے طورس کی طرف دیکھ کر سر کو مایوسانہ جنبش دی۔

"وقت کا انتظار کیجئے میرے آقا!" کاکے طورس نے آہستہ سے کہا۔

اب میری خواہش تھی کہ کچھ دیر کے لئے لیٹ جاؤں . . . لیکن میں خاموش رہا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ قافلے والوں میں سے کچھ ایک تخت نما تخت اپنے کاندھوں پر اٹھائے اوپر آ رہے ہیں۔

"تیار ہو جائیے میرے آقا!" . . . کاکے طورس آہستہ سے بولا۔

"اب آپ اپنے شایانِ شان استقبال کے لئے تیار ہو جائیے۔"

بوڑھا آدمی جو شاید میر کارواں تھا آنے والوں کی سربراہی کر رہا تھا۔

تخت میرے قریب لاکر رکھ دیا گیا اور بوڑھے آدمی نے گھٹنوں کے
بل گر کر کہا۔

"اے دیوتاؤں کے ہرکارے . . . اے برگزیدہ ہستی . . . ہماری
میزبانی قبول کر . . . میری بیٹی ربۃ آتیس کی کنواری تیرا انتظار کر رہی
ہے . . . اس نے تیرے لئے ان بکریوں کا دودھ دوہا ہے جو ربۃ آتیس
کی قربان گاہ کے لئے مخصوص ہیں ۔"

میں اس تخت پر بیٹھ گیا، اور چار قوی ہیکل آدمی اسے اپنے
کاندھے پر اٹھائے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ کاکے طورس بھی تخت
کے ایک پائے پر ہاتھ رکھے ساتھ ہی ساتھ چل رہا تھا۔

نیچے پہنچ کر وہ بائیں جانب مڑے اور پھر دوسری ڈھلان میں
اترنے لگے۔ اس پر پہلے میری نظر ہی نہیں پڑی تھی۔

یہاں کسی قدر نشیب میں دور تک چھوٹے چھوٹے خیمے نصب تھے۔
ایک خیمے کے سامنے میرا تخت زمین پر رکھ دیا گیا . . . وہ
سب آگے پیچھے جا رہے تھے۔ کچھ دیر کے لئے میں قطعی بھول گیا کہ
حقیقتاً کون ہوں۔

خیمے کے اندر ساری سفری آسائشیں موجود تھیں۔ تھوڑی دیر
بعد میں وہاں تنہا رہ گیا۔ کاکے طورس بھی چلا گیا تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ بستر پر لیٹ کر گہری نیند سو جاؤں۔ اس
کے لئے آگے بڑھا ہی تھا کہ خیمے کا پردہ اٹھا اور ایک لڑکی دودھ کا

پیالہ دونوں ہاتھوں میں اٹھائے اندر داخل ہوئی . . .

میں جہاں تھا وہیں رک گیا۔

یہ . . . یہ لڑکی . . . آتیس کے اس بُت سے مشابہ
تھی . . . جو میں نے قومی عجائب گھر میں دیکھا تھا . . . میں حیرت
سے آنکھیں پھاڑے اُسے گھورتا رہا۔

خیمے کی فضا عجیب سی خوشبو میں نہا گئی تھی . . . میں نے دیکھا کہ
اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور آنکھیں میرے چہرے پر لگی ہوئی ہیں
اس پر سحر زدگی کا سا عالم طاری ہو گیا تھا۔

اچانک دودھ کا پیالہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ پڑا اور میں نے
اس کی آنکھوں میں خوف زدگی کے آثار دیکھے۔

پیالہ اٹھانے کی بجائے وہ دوزانوں بیٹھ گئی اور ہاتھوں میں منہ
چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

میں اسے دلاسا دینا چاہتا تھا، لیکن اپنے ہی ہونٹوں کو جنبش بھی
نہ دے سکا۔

پھر میں نے اسی کی آواز سنی، وہ سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی...

پانچویں بار۔ ۔ ۔ یہ پیالہ پانچویں بار میرے ۔ ۔ ۔ ہاتھ سے گرا ہے ۔ ۔ ۔
اُف میری بدنصیبی ۔ ۔ ۔ تمہیں یاد بھی ہوگا ؟"

پھر میں نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ناکام رہا۔

اس کی مترنم آواز اب تیز قسم کی سرگوشی میں تبدیل ہو چکی تھی ۔

پہلی بار پورے چاند کی رات تھی ۔ ۔ ۔ تم زخمی تھے ۔ ۔ میں تمہارے لئے دودھ لاتی تھی اور پیالہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا ۔ ۔ ۔ دوسری بار مجھ پر ہاپی[1] کا عتاب نازل ہوا تھا، تم زنجیروں میں جکڑے ہوتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ پیاس کے مارے تمہاری زبان لٹک پڑی تھی ۔ ۔ ۔ ہاپی کے قدموں میں پڑے ہوتے تم ایک ایک قطرے کو ترس رہے تھے ۔ ۔ ۔ میں نے ہاپی کی موجوں سے پیالہ بھرا۔ لیکن صد حیف تم پیاسے ہی رہے ۔ ۔ ۔ پیالہ میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا ۔ ۔ ۔ ! ۔ ۔ ۔ اور تمہیں ہاپی کی بپھری ہوتی موجیں اپنے ساتھ بہا لے گئی تھیں ۔ تیسری بار ۔ ۔ ۔ تیسری بار ۔ ۔ ۔ نہیں میں اب کچھ نہ کہوں گی، ہر بار یہی ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں تمہیں حاصل کر لوں گی لیکن وہ خوفناک پرچھائیں میری تقدیر کو روندتی ہوتی نکل جاتی ہے ۔"

وہ خاموش ہو گئی اور میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ زمین پر گرے ہوتے دودھ پر پیر پھسل گیا۔

گرا اور اس بُری طرح گرا کہ سر پتھریلی زمین سے ٹکرا کر گویا پاش پاش ہو گیا ۔ ۔ ۔ درد کی ایک بہت بڑی لہر تھی جو تیزی سے چکرانے والے

بھنور میں تبدیل ہو گئی تھی ۔ ۔ ۔ پھر تاریکی اتھاہ تاریکی ۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ تاریکی کتنی دیر میں رفع ہوئی تھی، پھر میں نے دیکھا کہ میں زنجیروں میں جکڑا ہوا ایک قافلے کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوں میرے دائیں بائیں دو قوی ہیکل آدمی زنجیروں کے سرے تھامے ہوئے مجھے گھسیٹ کرلے جا رہے ہیں، میری طرح کچھ اور قیدی بھی ہیں۔

جب میں ان کے قریب پہنچا تو مجھے ان میں مار گزیدہ قافلے کا بوڑھا سربراہ بھی دکھائی دیا۔ اس کی حالت ابتر تھی، وہ جب چلتے چلتے گر پڑتا تو اس کے زنجیر بردار اسے کسی مردہ جانور کی طرح گھسیٹنے لگتے۔

دفعتاً اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چیخنے لگا "اے میرے جان بخش ۔ ۔ ۔ اے میرے دیوتاؤں کے سرکار ۔ ۔ ۔ اسامی درندوں نے ہم پر حملہ کر کے ہمارا سب کچھ تباہ کر دیا ۔ ۔ ۔ آمیس کی کنواری میری بیٹی ان دحشیوں کے قبضے میں ہے ۔ ۔ ۔"

میں خاموش رہا ۔ ۔ ۔ وہ برابر چیخے جا رہا تھا ۔ ۔ ۔ "اگر وہ آمیس کے ہیکل کے قابل نہ رہ گئی تو تم جواب دہ ہو گے ۔"

مجھے وہ لڑکی یاد آئی ۔ ۔ ۔ اور میں چلتے چلتے رک گیا! زنجیر بردجھلا کر پلٹے اور مجھے آگے گھسیٹ لے جانے کے لئے زور لگانے لگے۔ لیکن میں نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی۔

---

[1] دریائے نیل

انہوں نے چیخ چیخ کر اپنے دوسرے ساتھیوں سے کچھ کہا اور وہ
نیزے تانے ہوئے مجھ پر جھپٹ پڑے۔

میری کمر کے گرد پڑی ہوئی زنجیروں کے سرے اس ہنگامے میں
ان دونوں کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے تھے۔۔۔ اور میں نے انہیں
مضبوطی سے گرفت میں لے کر گردش دینا شروع کر دیا تھا۔

زنجیر جس پر بھی پڑتی پھر نہ اٹھ سکتا، ان کے نیزے ان کے ہاتھوں
سے نکل کر دور گر رہے تھے۔

تب میں نے دیکھا کہ مجھ پر چاروں طرف سے یورش ہو گئی ہے۔
قوی ہیکل وحشی سپاہی چیختے چلاتے ہوئے مجھ پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔
پھر ایک بڑی تیز آواز ابھری جو یلغار کرنے والے وحشیوں کے
شور سے مختلف تھی۔

اس آواز نے جیسے ان کا جوش ٹھنڈا کر دیا تھا، یک بیک
انہوں نے اپنے ہاتھ روک لئے اور بتوں کی طرح ساکت وصامت
ہو گئے، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ کائی کی طرح پھٹ کر کسی
کے لئے راستہ بنا رہے ہیں۔ آنے والا بڑی شان سے اکڑتا ہوا
میری طرف آرہا تھا، لباس اس کا بھی ان وحشیوں کا سا تھا لیکن
اس نے اپنی ٹوپی میں شتر مرغ کے پر لگا رکھے تھے۔

اور جب وہ میرے قریب پہنچا تو میں چونک پڑا۔
یہ ابوالفرحان تھا۔۔۔ ابوالفرحان جسے میں پہلے کبھی تاسیفن یا

اسد کے روپ میں بھی دیکھ چکا تھا۔

مجھے قریب سے دیکھ کر وہ بھی کسی شکاری کتے کی طرح چوکنا ہو
گیا، بڑا سا تیغہ اس کے ہاتھ میں تھا اور آنکھیں گویا خون اگل رہی
تھیں۔

اس نے پھر کچھ کہا اور وحشی دائرے کی شکل میں دور تک پیچھے
ہٹتے چلے گئے۔ اس شخص کی زبان ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی
لیکن انداز سے صاف ظاہر تھا کہ جیسے مجھ سے دست بدست مبارزت
کا خواہاں ہو۔ میں نے زنجیروں کو مضبوطی سے تھام لیا اور اس کے حملے
کا منتظر رہا۔

دفعتاً مجھے اپنی یاقوت کی انگشتری یاد آئی۔۔۔!

وہ اب بھی میری انگلی میں موجود تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر نگینے
کا رخ اپنے مقابل کی طرف کر دیا۔ پھر تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ حواس
باختہ ہو گیا ہو۔۔۔ پاگلوں کی طرح اچھلنے کودنے لگا تھا۔ تیغہ اس کے
ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔

اس کے آدمی اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

پھر اچانک اس نے میری طرف سے منہ موڑ لیا اور دوڑنا شروع
کر دیا۔۔۔ وہ کچھ کہتا بھی جا رہا تھا۔

اس کا بھاگنا تھا کہ اس کے سپاہی بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں جہاں
تھا وہیں کھڑا رہا۔۔۔ لیکن یاقوت کے نگینے سے چھوٹنے والی لہریے دار

کرنیں بجلی کے کڑاکے کی سی آواز کے ساتھ ان کے سروں پر
گر رہی تھیں۔

ان میں سے جو بچ گئے تھے . . . چٹانوں کی دراڑوں میں گھس
کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

بوڑھا قافلہ سالار گرتا پڑتا میری طرف آ رہا تھا۔ میرے قدموں پر
گرتے ہوئے اس نے دو سسکیاں لیں اور کہنے لگا "ہم بے خبر سو رہے
تھے کہ وہ ہم پر ٹوٹ پڑے، بہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ہمیں
قیدی بنا کر لے چلے تھے۔"

"جاؤ . . . دیکھو . . . تمہارے کتنے آدمی باقی بچے ہیں!" میں
نے جھک کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اچانک مجھے کاکے طورس یاد آیا اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔

"میرا خادم کہاں ہے" میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا میرے مالک۔"

"اسے بھی تلاش کرو، اور ہاں تمہاری بچی کہاں ہے؟"

"میں یہ بھی نہیں جانتا میرے مالک!" اس نے کہا اور پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگا۔

پھر اٹھ کر چلنے ہی والا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اس کے جسم
کو زنجیروں سے آزاد کیا اور پھر اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی زنجیر بھی کھولنے
لگا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا اس طرف بڑھ گیا تھا، جہاں اس کے ساتھی پڑے ہوئے
تھے۔

ان کی تعداد چالیس تھی، قریب قریب سبھی زخمی تھے۔ ان میں کاکے طورس
نہ ملا اور میری تشویش اور بڑھ گئی۔

دن ڈوبنے لگا تھا . . . اور ہم سب بے آب و گیاہ چٹانوں پر
پڑے ہوئے تھے۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس سرسبز وادی سے یہاں کیوں کر پہنچے...
آنیسس کی ہم شکل لڑکی کے ہاتھوں سے دودھ کا پیالہ گرنے کے بعد سے
اب تک کتنا وقت گزرا تھا، اس کا اندازہ مجھے نہ ہو سکا! ہوتا بھی کیونکر..؟
آخر میں کس طلسم میں گرفتار ہوں . . . یہ اسامی کون ہیں جنھوں نے
مار گزیدہ قافلے پر حملہ کیا تھا۔

میں نے بوڑھے سے ان کے متعلق پوچھا۔

وہ کراہتا ہوا بولا "درندے ہیں میرے مالک . . . چوہوں
کی طرح غاروں میں چھپے رہتے ہیں، قافلوں کو لوٹنا ہی ان کا کام ہے
. . . خود کو عقاب دیوتا کا پجاری کہتے ہیں۔"

"مجھے اپنے خادم اور تمہاری لڑکی کی فکر ہے۔"

"پتہ نہیں ان کا کیا حشر ہوا . . . میں نے تمہارے خادم
کو گرفتاروں میں دیکھا تھا، اس وقت طیبہ بھی زندہ تھی۔"

"طیبہ . . ."

"ہاں میرے مالک ربّہ آتیسس کی اس کنواری کا نام طیبّہ ہے۔"

"یہ نام . . . یہ نام . . ." میں الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے میری سماعت پر عجیب سا اثر ڈالا تھا . . . عجیب سی خوشبوئیں ذہن میں لہرانے لگی تھیں، اس احساس کو میں کوئی نام نہ دے سکا، جو ایک وجود کے دھندلے سے تصوّر سے وابستہ تھا . . . وہ وجود . . . خداوندا . . . کیا وہ وجود طیبّہ ہی تھا۔

"ہم انہیں کہاں تلاش کریں . . . !" میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

"مجھ سے زیادہ تم باخبر ہو میرے مالک . . . تم جو جلا دینے والی قوت کا سرچشمہ ہو . . . !"

"کفر نہ بکو!" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"کفر . . . ؟ یہ کیا چیز ہے میرے آقا" وہ متحیرانہ لہجے میں بولا۔

"تم نہیں جانتے . . . اور میں ابھی تمہیں سمجھا نہیں سکتا" بوڑھا اپنی بیٹی کو یاد کر کے رونے لگا اور میں انگشتری کے نگینے کو گھورے جا رہا تھا۔

دفعتاً مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے نگینہ وسعت اختیار کر رہا ہو . . . پھر وہ کسی ٹیلی ویژن اسکرین کی طرح روشن ہو گیا اور میں نے اس پہ پتھریلے راستوں کا عکس دیکھا . . . دو گھوڑے تیزی سے دوڑتے نظر آتے . . . اور ایک درّے میں داخل ہو کر غائب ہو گئے . . .

سواروں کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون تھے۔

پھر منظر بدلا . . . اور میں نے دیکھا کہ کاکے طورس لنگڑاتا ہوا ایک طرف چلا جا رہا ہے . . . راستہ وہی تھا . . . جس پہ گھوڑے نظر آئے تھے . . . اور میں نے اسے بھی درّے میں داخل ہوتے دیکھا۔

اس کے بعد نگینہ اپنی اصلی حالت پہ آگیا تھا۔

سورج دُور کی پہاڑیوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا، ابھی اتنی روشنی تھی کہ ہم دور تک دیکھ سکتے تھے۔

بوڑھا اب خاموش ہو کر زانوؤں میں سر دیئے بیٹھا تھا، میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس کا شانہ چھوا، وہ چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ادھر . . . ان چٹانوں کے پیچھے کیا ہے" میں نے سامنے والی چٹانوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔

"میں نہیں جانتا میرے مالک" . . . وہ کراہ کر بولا۔

"کیا تم وہاں تک میرے ساتھ چلو گے . . . طیبّہ کی رہائی ضروری ہے"

"تم جاننے والے ہو . . . میں فانی انسان کیا سمجھوں گا کہ کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری . . . جس طرح بھی ممکن ہو گا میں تمہارے ساتھ چلوں گا میرے آقا"

اپنے لوگوں سے کہہ دو کہ ہماری واپسی تک یہیں رہ کر اپنے زخموں کی دیکھ بھال کریں . . . !"

"اگر ہم بھی نہ ہوتے تو وہ ڈر کے مارے مرجاتیں گے" بوڑھے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا تو تم ٹھہرو . . . میں تنہا جاؤں گا . . . !" میں نے کہا اور محسوس کیا کہ بوڑھا بھی یہاں سے ہٹنا نہیں چاہتا۔

میں نے قریب ہی پڑا ہوا ایک نیزہ اٹھایا اور سامنے والی چٹان تک پہنچنے کے لئے ڈھلان میں اترنے لگا۔

بڑا دشوار گزار راستہ تھا۔ ڈھلان کے اختتام پر بھی یہ دشواری ختم نہ ہوئی اور پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو پھلانگتا ہوا میں آگے بڑھتا رہا۔

پھر سامنے والی چٹانوں کی چڑھائی شروع ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ آخر میں ادھر کیوں آیا ہوں . . . چٹانوں کی دوسری طرف کیا دیکھنا چاہتا ہوں؟

بس ایک دھن تھی جو اوپر لئے جا رہی تھی۔ کہیں کہیں تو قدم جمانا بھی دشوار ہو جاتا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی مضبوط ہاتھ نے میرا بازو پکڑ کر سہارا دیا ہو۔

آہستہ آہستہ دھندلکا پھیل رہا تھا اور سناٹے کا یہ عالم تھا کہ جیسے میں نے موت کی وادی میں قدم رکھا ہو۔ کسی قسم کی کوئی آواز سنائی

نہ دیتی تھی۔

اوپر دیکھ کر میں نے دوسری طرف نظر دوڑائی اور چونک پڑا۔ ادھر کی ڈھلان کے اختتام سے پھر وہی راستہ شروع ہوتا تھا۔ جس پر میں نے کچھ دیر پہلے گھوڑے دوڑتے دیکھے تھے اور بھیرکا کے طورس بھی نظر آیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر انگشتری کے نگینے پر نظر ڈالی، لیکن اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

نیزہ ٹیک ٹیک کر میں دوسری طرف کی ڈھلان میں اترنے لگا۔ ابھی اتنا اجالا تھا کہ احتیاط سے قدم اٹھا سکتا لیکن جیسے ہی ڈھلان ختم ہوئی پوری طرح اندھیرا پھیل گیا۔ میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ نڈھال ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے . . . . . اندھیرے میں آگے بڑھتے رہنا ناممکن تھا، اتنا گھور اندھیرا میں نے کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔

آخر تارے کہاں غائب ہو گئے، جب کہ بادل بھی نہیں تھے۔ ہوا پتھروں کے درمیان سرسراتی تو ایسا لگتا کہ جیسے بے شمار سانپ پھنکارتے ہوئے رینگتے پھر رہے ہوں . . . میں کیا کروں؟ میں نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیئے۔ ٹھیک اسی وقت مجھے چہرے کے آس پاس ہلکی سی روشنی کا دائرہ نظر آیا۔

یہ روشنی . . . یہ روشنی انگشتری کے نگینے سے پھوٹ رہی

تھی، اور پھر میں نے کسی کے قدموں کی آواز سنی اور زانو پر رکھے ہوئے نیزے کو سنبھالتا ہوا اٹھ گیا۔

آواز کے رُخ پر میں نے نیزہ تان لیا تھا۔ ۔ ۔ نگینے کی روشنی پھر غائب ہوگئی۔

قدموں کی چاپ قریب آتی جا رہی تھی۔ میں نے آنے والے کو للکار کر بڑی پھرتی سے اپنی پوزیشن بدل لی۔

آنے والا میری آواز کی سمت لپکا تھا اور وہ اب اتنا قریب تھا کہ سائے کی طرح نظر آنے لگا تھا۔

میرے نیزے کی اَنی اس کے جسم سے جا لگی۔

"یہ میں ہوں ۔ ۔ ۔ میرے آقا" آواز آئی۔

"کاکے طورس" میرا لہجہ پُرمسرت تھا۔

میں نے نیزہ جھکا دیا۔

وہ قریب آکر بولا "میں نے ابھی ہلکی سی روشنی میں تمہارا چہرہ دیکھا تھا میرے آقا"

"نہ دیکھتے تو مجھ تک کیسے پہنچتے؟"

"میں جانتا تھا میرے آقا۔ ۔ ۔ تم مجھے اپنے پاس بلا ہی لوگے چاہے میں کہیں بھی کسی بھی مصیبت میں گرفتار ہوں"

"میں نے تمہیں اس درّے میں داخل ہوتے دیکھا تھا"

"بھلا تمہاری آنکھوں سے کیا پوشیدہ رہ سکتا ہے میرے آقا"

"میں تمہاری اور طیبہ کی تلاش میں نکلا تھا"

"وہ اسے لے گئے۔ میں وہ جگہ بھی دیکھ آیا ہوں جہاں وہ لے جائی گئی ہے۔ ۔ ۔ لیکن اس کی رہائی میرے ہاتھوں ناممکن تھی"

"چلو مجھے دکھاؤ۔ ۔ ۔ وہ جگہ"

"تم موت و زیست کے مالک ہو۔ ۔ ۔ ہر طرح وہاں پہنچ جاؤ گے"

"کاکے طورس میں تمہیں پہلے ہی سمجھا چکا ہوں کہ میرے لئے اس قسم کے الفاظ مت استعمال کیا کرو۔ ۔ ۔!"

"اور میں اسے مناسب سمجھتا ہوں، میرے مالک کہ تم انہیں سن کر خاموش رہ جایا کرو، کیونکہ اس کے خلاف کچھ کہنے سے تمہاری قوت زائل ہوسکتی ہے میرے آقا۔ ۔ ۔ اور ان حالات میں یہ کسی کیلئے بھی بہتر نہ ہوگا"

میں خاموش رہا، خاموشی کے سوا، چارہ بھی کیا تھا۔ پتہ نہیں کب اس طلسم سے چھٹکارا ملے۔

"اچھا تو چلو۔ ۔ ۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا "میں ان اسامیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے بتاتے چلنا"

"سب سے پہلے روشنی چاہیئے میرے مالک"

"روشنی میں کہاں سے لاؤں"

"تمہارے پاس روشنی نہ ہوتی تو میں تم تک کیسے پہنچتا۔ ۔ ۔؟"

روشنی کیونکہ پیدا ہوتی تھی۔ ۔ ۔ میں سوچنے لگا۔ ۔ ۔ اوہو۔ ۔ ۔

یاد آیا . . . میں نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑے تھے اور سر کے گرد روشنی کا ہالہ بن گیا تھا۔

میں نے نیزہ کاکے طورس کو تھما دیا اور بال مٹھیوں میں جکڑے ہی تھے کہ سر چکرا گیا۔

پھر مجھے ہوش نہیں کہ کیا ہوا تھا۔ وقت گزرا تھا یا میں نے وقت کو گرفت میں لے کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا تھا۔ سب کیا تھا . . . اندھیرا کہاں غائب ہو گیا۔ اب تو سر پر سورج چمک رہا تھا اور ہم گھوڑوں پر سوار تھے۔

کاکے طورس کے جسم پر میں آسامیوں کا لباس دیکھ رہا تھا۔ خود پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ میرا لباس بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔!

"کاکے طورس! کیا میں پچھلی شام"... میں نے اُسے مخاطب کر کے کچھ پوچھنا چاہا۔ لیکن پھر جملہ پورا کئے بغیر خاموش ہو گیا۔ ہم اسی راستے پر جا رہے تھے جس پر پچھلی شام انگشتری کے نگینے میں دو گھوڑے دوڑتے دیکھے تھے۔

منظر پوری طرح یاد آ گیا' ہمارے گھوڑے بالکل اسی طرح دوڑ رہے تھے۔

تو کیا . . . تو کیا . . . انگشتری کے نگینے میں مستقبل نظر آیا تھا۔ عقل چکرا کر رہ گئی۔ ہو بہو وہی سچویشن تھی۔

ہمارے گھوڑے دوڑتے رہے۔ رفتار اتنی تیز تھی کہ ہم ایک دوسرے سے گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ مخالف سمت سے تیز ہوا ہمارے چہروں پر لگ رہی تھی اور ہماری آنکھیں بھنچی ہوئی تھیں۔ خفیف سے درّوں سے ہم راستہ دیکھ رہے تھے۔

ایک جگہ کاکے طورس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔

میں نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی اور نیچے اتر کر اس کی خبر لینے پلٹا۔ وہ بچ گیا تھا۔ لیکن گھوڑے کی ٹانگ گئی تھی۔ وہ بیٹھا تو پھر اٹھ ہی نہ سکا۔ کاکے طورس کودکر الگ ہو گیا تھا۔

"اب میں پیدل چلوں گا!" وہ ہانپتا ہوا بولا۔ "پیاسا بھی ہوں"

"کیا ہمارے پاس پانی موجود ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

پانی . . . نہیں تو . . . لیکن ادھر ایک چشمہ ہے . . . ہم اپنی چھاگلیں بھی بھر لیں گے"

اس نے بائیں جانب اشارہ کیا تھا! پھر میں نے اس کو اسی طرف بڑھتے دیکھا . . . وہ ایک درے میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

مجھے پھر یاد آیا کہ وہ درّہ بھی یہی تھا' جس میں میں نے کاکے طورس کو غائب ہوتے دیکھا تھا۔

میں اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا . . . دونوں چھاگلیں وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ انتظار طویل ہوتا گیا اور میری

تشویش بڑھتی گئی۔

کیا مجھے آگے بڑھ کر دیکھنا چاہیئے۔ پتہ نہیں اس پر کیا گزری؟

گھوڑے پر بیٹھ کر میں اس درّے کی طرف روانہ ہوگیا، اچانک میں نے محسوس کیا کہ گھوڑا ہی مجھے اس طرف لئے جارہا ہے۔ اس میں میری کوشش کو دخل نہیں۔

امتحان کے لئے میں نے گھوڑے کو بائیں جانب موڑنے کی کوشش کی، لیکن وہ بائیں جانب گردن موڑے ہوئے درّے کی سیدھ ہی میں دوڑے جا رہا تھا۔

. . . .

درّہ زیادہ طویل نہیں تھا، دوسری طرف پہنچتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے دُنیا ہی بدل گئی ہو۔

بڑی شاداب وادی تھی اور درّے کے اختتام سے تھوڑے ہی فاصلے پر شفاف پانی کا ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔

گھوڑا درّہ پار کر کے خود بخود رک گیا۔ میں نے دیکھا کہ کاکے طورس چشمے کے کنارے اوندھا پڑا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید وحشیوں ہی کی طرح پانی پینے کی کوشش کر رہا ہے . . . لیکن قریب پہنچنے پر پتہ چلا کہ ہوش ہی میں نہیں ہے . . . آنکھیں بند تھیں اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

وہ دونوں چھاگلیں بھی نہ دکھائی دیں، جو پانی کے لئے ساتھ لایا تھا۔

بڑی مشکل سے وہ ہوش میں آیا اور کسی خوفزدہ پرندے کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"تجھے کیا ہوگیا تھا کاکے طورس؟"

وہ کچھ نہ بولا۔ سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ کر سر جھکا لیا تھا۔

"چھاگلیں کہاں ہیں؟" بالآخر میں نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

"وہ . . . وہ . . . مجھے کچھ یاد نہیں . . . میرے مالک"

"تو ادھر کیوں آیا تھا؟"

"یہ بھی یاد نہیں . . . میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے تمہارا حکم ماننا چاہیئے"

"میں پوچھتا ہوں چھاگلیں کہاں ہیں؟" میں نے اور زیادہ جھلاہٹ کا مظاہرہ کر کے پوچھا۔

اس نے میری یاقوت کی انگشتری کی طرف اشارہ کیا اور سر جھکائے کھڑا رہا۔

میں نے انگشتری کے نگینے پر نظر ڈالی لیکن اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، بس ایک معمولی یاقوت کی طرح دمکتا رہا۔

"یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے" میں نے جھلا کر کہا۔

"تو پھر وقت کا انتظار کرو میرے آقا . . ." اس نے ایک طرف بڑھتے ہوئے کہا "میں کوئی مناسب سی سایہ دار جگہ تلاش کرتا ہوں"

"کاکے طورس کہیں تو اپنا ذہنی توازن تو نہیں کھو بیٹھا ہے ۔"

"ارے ہیں بالکل ہوش میں ہوں میرے مالک ۔"

"مارگزیدہ قافلے کے زخمیوں کو میں نے اچھے حال میں نہیں چھوڑا تھا ۔"

"پیچھے مڑ کر دیکھنا بعض اوقات مناسب نہیں ہوتا" کاکے طورس نے کہا اور آگے بڑھ گیا ۔ میں وہیں کھڑا اسے گھورتا رہا ۔

وہ تھوڑے فاصلے پر پھولدار قد آدم جھاڑیوں میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔

ہر طرف عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے ہوا میلوں دور سے خوشبوؤں میں بسی چلی آ رہی ہو ۔

مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی ۔ میں ہر طرف سے توجہ ہٹا کر چشمے کی طرف بڑھا ۔ دونوں ہاتھ پانی میں ڈال دیئے اور چلو میں اٹھا کر گھونٹ لینے ہی والا تھا کہ ایک گرجدار آواز گونجی ۔

"ٹھہرو . . . !"

میں چونک پڑا ۔ چلوؤں سے سارا پانی چھلک گیا ۔

چاروں طرف دیکھنے لگا کیونکہ آواز کی سمت کا تعین نہیں کر سکا تھا ۔

آواز پھر سنائی دی . . . "جاؤ . . . اسی کنج میں جاؤ . . . جہاں وہ گیا ہے جس کے چہرے اور سر پہ بال نہیں ہیں ۔"

اس بار بھی آواز کی سمت کا تعین نہیں ہو سکا . . . مجھ سے کاکے طورس کی تقلید کرنے کو کہا گیا تھا کہ اس کا حلیہ یہی تھا . . . بھنویں اور پلکیں تک صاف تھیں ۔

پہلے انتباہ کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ میں پانی پیئے بغیر اس کنج میں چلا جاؤں ۔

خداوندا میں کس عذاب میں مبتلا ہو گیا ہوں . . . یہ کیا چکر ہے . . . اس سے کب گلو خلاصی ہو گی ۔

میں کسی بے حد تک اکتائے ہوئے آدمی کی طرح کنج کی طرف مڑا . . . اور کاکے طورس کو آواز دیتا ہوا اس میں داخل ہو گیا ۔

لیکن دوسرا لمحہ یقیناً ہیبت ناک تھا . . . اگر ذرا سا بھی غافل رہا ہوتا تو اگلا قدم مجھے ایک گہرے غار میں لے جاتا اور میری ہڈیاں سرمہ ہو جاتیں ۔

آگے راہ مسدود تھی . . . غار اتنا گہرا تھا کہ اس میں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا ۔

"کاکے طورس" میں نے پھیپھڑوں کا پورا زور صرف کر کے اسے آواز دی ۔

اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے غار کی اتھاہ گہرائی سے آواز آئی ہو "آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دو میرے مالک . . . ملیّہ خطرے میں ہے ۔"

یہی آواز دوبارہ سنائی دی، اور میری آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔
میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بعد میں نے خود چھلانگ نہیں لگائی تھی بلکہ کسی نے مجھے دھکیل دیا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں جنہیں میں کھولنے کی جرأت نہ کر سکا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں لفٹ کے ذریعہ آہستہ آہستہ بلندی سے نیچے جا رہا ہوں اور پھر لفٹ کے رکنے ہی کا جھٹکا محسوس ہوا۔

آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ دراصل تیز قسم کی روشنی کا احساس اس کا محرک بنا تھا۔

آنکھیں چندھیا کر پھر بند ہوگئیں۔ بڑی تیز اور چمکیلی دھوپ تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو۔

"آقا۔ ۔ ۔" کاکے طورس کی بھرائی ہوئی سی آواز سن کر میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔

وہ میرے قریب ہی کھڑا ہانپ رہا تھا۔

"ہم کہاں ہیں کاکے طورس" میں نے اس سے پوچھا۔

سورج کی تپش جھلسائے دے رہی تھی۔ ۔ ۔ اور حدِ نظر تک ریت کے تودے پھیلے ہوئے تھے۔ ۔ ۔ ایسا خوفناک ریگستان پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

"سب فریب ہے میرے آقا۔ ۔ ۔ وقت کا فریب۔ ۔ ۔ پل بھر کے لئے ٹھنڈی چھاؤں نصیب ہوتی ہے اور پھر وہی جھلسا دینے

والی دھوپ۔ ۔ ۔ وقت اور دھوپ چھاؤں۔ ۔ ۔ اس کے سوا زندگی میں اور کچھ نہیں رکھا۔"

"میں اس سے بھی گہری باتیں سوچ سکتا ہوں۔ ۔ ۔" "بکواس بند کرو۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں خود نہیں جانتا کہ ہم کہاں ہیں میرے مالک!" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"کیا تو نے مجھے آواز دی تھی؟"

"میں کچھ نہیں جانتا میرے آقا۔ ۔ ۔ کنج میں داخل ہوتے ہی میں یہاں آ پہنچا تھا۔"

"اوپر میں نے تیری آواز سنی تھی۔ ۔ ۔ تو نے کہا تھا۔ ۔ ۔ طیبہ خطرے میں ہے۔ آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دو۔"

"نہیں۔ ۔ ۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک منہ بالکل خشک ہوگیا، پیاس مزید چمک اٹھی، مجھے یاد آیا کہ میں چشمے سے پانی پینے سے رہ گیا تھا۔

کاکے طورس مجھے بڑے غور سے دیکھے جا رہا تھا۔

"اس لباس میں ہم سچ مچ درندے لگتے ہیں۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

ہم ابھی تک آسامی وحشیوں کے لباس میں تھے، لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ ۔ ۔ پیاس کے مارے دم لبوں پر تھا۔

دفعتاً کاکے طورس نے میری یاقوت کی انگشتری کی طرف اشارہ کیا۔

ابھی میں اس کی طرف متوجہ بھی نہ ہو پایا تھا کہ بائیں جانب سے شور بلند ہوا۔

آسامی وحشیوں کا ایک جم غفیر ٹیلوں کی اوٹ سے نکلا تھا اور مخالف سمت میں دوڑا جا رہا تھا۔

"اچھا موقع ہے . . . میرے آقا . . . ہم بھی ان میں مل جائیں!" کاکے طورس نے کہا۔

"مجھ میں سکت نہیں ہے . . . پیاس" میں نے بدقت کہا تھا۔

"انگشتری کا نگینہ چاٹ لو . . . میرے مالک"

بے اختیاری میں میں نے نگینے سے زبان لگا دی تھی . . . پھر مجھے یاد نہیں کہ کب میں نے دوڑنا شروع کر دیا تھا . . . تھوڑی دیر بعد میں نے خود کو آسامی وحشیوں کی بھیڑ میں پایا تھا . . کاکے طورس بھی میرے برابر ہی سے دوڑ رہا تھا۔

اب نہ مجھ میں پیاس کا غلبہ تھا اور نہ دھوپ کی تپش ہی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ آسامی وحشی ایک ایک کر کے گرتے جا رہے ہیں . . . اور پھر ہم دونوں کے سوا کوئی بھی اس دوڑ میں اپنے پیروں پر نہ کھڑا رہ سکا۔

"اب رک جاؤ . . . آقا . . . !" کاکے طورس نے ہانپتے ہوئے

کہا۔ اس کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا . . . ایک فرلانگ تک آسامی وحشی زمین پر گرے ہوئے تڑپتے نظر آتے۔

کاکے طورس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہانپنے لگا تھا، اس نے کچھ کہنا چاہا . . . لیکن صرف ہونٹ ہل کر رہ گئے، آواز نہ نکلی . . . پھر اس نے میری انگشتری کی طرف اشارہ کر کے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ غالباً چاہتا تھا کہ میں انگشتری کا نگینہ اس کے سر سے مس کر دوں۔

نہ جانے کیوں میں شدید ترین جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا، حالانکہ اس دوڑ دھوپ کا مجھ پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر بڑی بیدردی سے اس کے سر پہ ہاتھ مارا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقص کر رہی تھی۔

"شکریہ میرے آقا" اس نے گڑگڑا کر کہا "مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے دوبارہ زندہ ہوا ہوں"

"تو پھر کیوں نہ ایک ہاتھ اور رسید کر دوں کہ تم جوان بھی ہو جاؤ"

"میں اس بات پر دل کھول کر ہنسنا چاہتا ہوں، لیکن یہ بے ادبی ہو گی . . . اب تم ان وحشیوں پر بھی رحم کرو، ورنہ یہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے"

"میرے بس سے باہر ہے کہ فرداً فرداً ہر ایک کی پٹائی کرتا پھروں۔"

میرے ساتھ چلو۔ ۔ ۔ میرے آقا۔ ۔ ۔" وہ واپسی کے لئے مڑتا ہوا بولا۔ میں نے تیغے کے قبضے کو مضبوطی سے پکڑتے ہوتے کہا۔ ۔ "کیوں نہ میں تیرا سر قلم کردوں۔"

"کس لئے میرے آقا۔ ۔ ۔"

"اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو مجھے اس بھاگ دوڑ کے مقصد سے آگاہ کردے۔"

"مجھ سے زیادہ تم جانتے ہو میرے آقا۔ ۔ ۔ کیا تم نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ طیبہ کو رہا کرانا ہے۔"

"یہی بتادے کہ یہ طیبہ کون ہے؟ ۔ ۔ ۔ اور میری زندگی میں کہاں سے آکودی۔"

"یہ تو تقدیر بنانے والا ہی جانتا ہے۔ ۔ ۔ وہ جس نے تمہارے پرانے جسم کو ضائع کر کے تمہیں دوسرا جسم عطا کیا۔"

"اچھا بکواس بند کرو اور مجھے یہ بتا کہ میں ان وحشیوں کے لئے کیا کروں؟" میں ڈپٹ کر بولا۔

"ان کے لئے پانی کا ایک چشمہ جاری کردو۔"

"تو کیوں احمقانہ باتیں کر رہا ہے۔"

کاکے طورس نے انگشتری کی طرف اشارہ کیا۔

مجھے شدت سے غصہ آرہا تھا۔ ۔ ۔ میں نے سوچا اب اس نامراد

انگشتری سے بھی پیچھا چھڑانا چاہیئے، شاید اسی طرح میں پچھلی زندگی میں واپس جاسکوں۔

میں نے اسے انگلی سے کھینچ کر اتارا اور دور پھینک دیا، لیکن اسے گرتے دیکھنا بھی فطری امر تھا۔ وہ ان وحشیوں کے قریب جاکر گری تھی اور ٹھیک اسی جگہ سے پانی کی موٹی سی دھار ابل پڑی تھی۔

کاکے طورس میرے سامنے سجدے میں گر گیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ۔ "نئے جسم کے ساتھ پرانی ہی روح ملی ہے تمہیں میرے آقا ورنہ تم ایسا کیوں کرتے۔ ۔ ۔!"

اور ٹھیک اسی وقت میں نے اپنی انگلی میں وزن محسوس کیا وہ انگشتری حیرت انگیز طور پر واپس آگئی تھی، میں نے طویل سانس لی اور تن بہ تقدیر ہوگیا۔ لیکن کاکے طورس پر بدستور غصہ تھا۔ میرے بارہا منع کرنے کے باوجود بھی اس نے اپنی سجدوں والی روش ترک نہیں کی تھی۔

"اٹھ ورنہ ٹھوکر ماروں گا۔" میں زور سے دہاڑا اور وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھا لیکن بیحد خوش نظر آرہا تھا۔

"دیکھو میرے آقا" ان وحشیوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"میں نے دیکھا کہ وہ زمین سے ابلنے والے پانی پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں! میری جھنجھلاہٹ دور ہوگئی، مسرت کی ہلکی سی لہر نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ میری وجہ سے وہ بچ گئے، جی کھول کر سیراب ہو رہے ہیں۔ جو اپنی پیاس بجھا چکے تھے۔ زمین پر بہتے ہوتے پانی کو اکٹھا کرنے

کے لئے اس کے گرد مینڈھ بنا رہے تھے۔

کچھ گرتے پڑتے ہماری طرف آ رہے تھے جیسے ہی وہ قریب پہنچے کاکے طورس چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگا۔

وہ حیرت سے منہ پھاڑے سنتے رہے اور اس کے خاموش ہوتے ہی سجدے میں گر گئے۔

کاکے طورس میری طرف دیکھ کر آہستہ سے بولا "یہ جو کچھ کر رہے ہیں کرنے دو، اسی میں بھلائی ہے۔ . . یہ وہی لوگ ہیں، جو تم سے شکست کھا کر بھاگ گئے تھے، اپنے دوسرے ساتھیوں سے بچھڑ گئے ہیں"

"تو نے ان سے کیا کہا"

"وہی جو تم نے ان کے لئے کیا میرے آقا۔ . . اگر زمین سے چشمہ نہ پھوٹتا تو یہ مر جاتے۔ . . اب یہ تمہارے خادم ہیں۔ . . ان کے اصل سردار میں اتنی طاقت کہاں کہ وہ انہیں موت سے بچا سکے"

میں کچھ نہ بولا، بولتا بھی کیا، خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

کاکے طورس انہیں مخاطب کر کے پھر کچھ کہنے لگا وہ اٹھے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے، اتنی دیر میں دوسرے بھی وہاں آ گئے تھے۔

اچانک میں نے دھوپ کی تمازت میں نمایاں کمی محسوس کی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

آفتاب بادلوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ . . دیکھتے دیکھتے

دھوپ بالکل غائب ہو گئی اور کاکے طورس دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر پہلے سے بھی زیادہ پرجوش انداز میں تقریر کرنے لگا۔

ایک بار پھر وہ سب سجدے میں گر گئے اور میں دل ہی دل میں خدا کے حضور گڑگڑانے لگا۔

اے میرے رب مجھے معاف کر، میں اپنی مرضی سے اس شیطانی چکر میں نہیں پڑا۔ . . تو ہی مجھے اس سے نجات دلائے گا

کچھ دیر بعد وہ پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔

کاکے طورس نے پھر کچھ کہا اور ان میں ایک کھڑا ہو کر غالباً اس کے سوال کا جواب دینے لگا

اس کے بعد ہاتھ کے اشارے سے کاکے طورس نے اسے بیٹھ جانے کو کہا۔

اب وہ آہستہ آہستہ مجھ سے کہہ رہا تھا "وہ آئیس کی ہیکل کی کنواری کے لئے اپنی جانیں دے دیں گے اور آئیس سے ہمیشہ ڈرتے رہیں گے۔ میں نے انہیں ان کے سردار سے باغی کر دیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ طیبہ کہاں لے جائی گئی ہے۔ لیکن اس ہیبت ناک ریگستان سے نکلنا ان کی دانست میں ناممکن ہے"

"پھر تو مجھے کس قسم کی خوشخبری دینا چاہتا ہے!" میں نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

"تم انہیں یہاں سے نکال سکتے ہو میرے مالک ۔"

دھوپ سر سے غائب ہو گئی تھی اور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بڑے خوشگوار لگ رہے تھے۔

مجھے جمائیاں آنے لگیں اور میں نے کالاکے طورس سے کہا "کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں ۔ اب میرے کانوں میں اپنی بھاری بھرکم آواز نہ انڈیل ۔"

"سب کچھ تمہارے حکم کے تابع ہے ... میرے مالک ... وہ دیکھو ... !"

اس نے بائیں جانب ہاتھ اٹھا کر کہا "تمہیں آرام کی خواہش ہوئی اور انتظام ہو گیا۔"

میں نے مڑ کر دیکھا ۔ دور تک چھوٹے چھوٹے بیشمار خیمے ایستادہ نظر آئے۔

کالاکے طورس وحشیوں سے مخاطب ہو کر کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی وہ شور مچاتے ہوئے خیموں کی طرف دوڑ گئے۔

"میں نے ان سے کہا ہے" وہ میری طرف مڑ کر بولا "جس کی تم نے اطاعت قبول کی ہے یہ اس کا کرم ہے ... تم جو چٹیل میدانوں میں کھلے آسمان کے نیچے راتیں بسر کرتے ہو۔ اب ان خیموں میں آرام کرو"

"میں نے اپنے آرام کی بات کی تھی !" مجھے غصہ آ گیا۔

"ہاں ... میرے ... آقا ... تم اب آرام کرو گے" کالاکے طورس

نے خیموں کی طرف اشارہ کیا۔

پھر اس نے ایک خیمے تک میری رہنمائی کی۔

"اور یہ تو تم جانتے ہی ہو گے میرے مالک کہ اب تمہیں سپاہیوں کی طرح آرام کرنا ہے" اس نے خیمے کے اندر داخل ہو کر کہا۔

"میں نہیں سمجھا"

"اسلحہ سمیت آرام ... ان وحشیوں کا کچھ ٹھیک نہیں کہ ... پتا نہیں کب دماغ الٹ جائے"

"اوہو ... اچھا ... بس اب جاؤ" ... میں نے رک رک کر کہا۔ میری پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

پھر میں اسی حالت میں بستر پر گرا اور گہری نیند سو گیا۔ پتہ نہیں کب تک سوتا رہتا اگر جھنجوڑ کر نہ اٹھایا جاتا، آنکھ کھلی لیکن جھنجوڑنے والا نہ دکھائی دیا۔

میں اٹھ بیٹھا، خیمے میں اندھیرا تھا، اچانک میں نے کالاکے طورس کی سرگوشی سنی۔

"وہ خیمے چھوڑ کر فرار ہو رہے ہیں"

"کیوں ؟"

"وہ ایسے ہی ہیں مالک ... ان کے قول و فعل پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا"

ہم دونوں خیمے سے باہر نکلے ... سچ مچ وحشیوں نے خیمے اکھاڑ کر لپیٹ لیے تھے اور انہیں کاندھوں پر اٹھائے ہوئے خاموشی سے فرار ہو رہے تھے

ہمیں بالکل اسی انداز سے ان کے پیچھے ہو لینا چاہیئے۔" کاکے طورس نے کہا۔" انہوں نے غلط کہا تھا کہ وہ اس ریگستان سے نہیں نکل سکتے۔"

"پھر کیا کرنا چاہیئے؟"

"خواہش کرو میرے آقا کہ ہمارے شانوں پر بھی ایسے ہی لپٹے لپٹائے خیمے بار ہو جائیں۔ میں نے سوچا اور کاکے طورس کی خواہش پوری ہو گئی۔ اب ہم ان وحشیوں میں مل کر بگھے اندھیرے میں سفر کر رہے تھے۔ چلتے رہے . . . حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ ہم نے اپنے چہرے آنکھوں کے نیچے تک ڈھانپ رکھے تھے۔ سورج نکلتے ہی ہم ریگستان پار کر کے سرسبز پہاڑیوں والی ایک چھوٹی سی وادی میں داخل ہو گئے۔

"یہ سب اسی وادی میں رہتے ہیں۔" کاکے طورس آہستہ سے بولا۔" مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"کیا وہ نہیں ہو گی؟" میں نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

"مجھے شرمندہ نہ کرو میرے آقا . . . تم جانتے ہو کہ وہ یہیں کہیں ہو گی . . . وہ . . . وہ دیکھو۔" جس سمت اس نے اشارہ کیا تھا، میری نظر ادھر ہی اُٹھ گئی، درجنوں وحشی چٹانوں کی اوٹ سے نکلے تھے اور خیمہ بردار وحشیوں پر جھپٹ پڑے تھے۔

کاکے طورس نے اپنے کاندھے پر لدے ہوئے خیمے کو بڑی پھرتی سے زمین پر ڈال دیا۔ اور میں نے غیر ارادی طور پر اس کی تقلید کی۔ دوسرے وحشیوں نے اُن کے خیمے چھین لئے تھے . . . اور پھر میں نے

دیکھا کہ ان کے درمیان خونریز جنگ چھڑ گئی ہے۔

کاکے طورس جلدی سے بولا۔" انہیں اسی حال میں چھوڑ دو اور ان چٹانوں تک پہنچنے کی کوشش کرو جن کے پیچھے سے یہ برآمد ہوئے ہیں۔"

ہمیں اس میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کیونکہ وہ سب ایک دوسرے پر پلے پڑ رہے تھے۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہ کی۔ چٹانوں کے پیچھے ایک تاریک درّہ تھا۔ ہم اس میں داخل ہوئے . . . ذرا دیر بعد آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں تو کچھ کچھ سجھائی دینے لگا۔ درّے کا اختتام ایک بڑے سے غار کے دہانے پر ہوا۔ یہاں کچھ کچھ روشنی اوپر سے آ رہی تھی۔

غار میں داخل ہو کر میں نے جو کچھ دیکھا اس کے لئے میں تیار نہیں تھا... ایک طرف خشک لکڑیوں کا ڈھیر جل رہا تھا جس کی روشنی غار میں پھیلی ہوئی تھی... میں نے دیکھا کہ ابوالفرحان کا ہم شکل وحشی سردار تیغہ کھینچے ہوئے طیّہ کو دھمکا رہا ہے۔

ابوالفرحان . . . میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ہر جگہ ابوالفرحان کا
نفرت انگیز چہرہ . . . یہ مردود آسامی دشتی سردار بھی اسی کا ہمشکل تھا۔

جیسے ہی اسے ہماری موجودگی کا احساس ہوا وہ بڑی تیزی سے مڑا اور
تیغہ ہلا ہلا کر چنگھاڑنے لگا . . . غالباً وہ ہمیں اپنوں ہی میں سے سمجھا تھا کیونکہ
ہم نے اپنے چہرے آنکھوں تک ڈھانک رکھے تھے اور ہمارے جسموں پہ
آسامی وحشیوں ہی کا لباس تھا۔

میں نے بھی کمر سے لٹکا ہوا تیغہ سنبھالا، اور کچھ سوچے سمجھے بغیر اس
پر جھپٹ پڑا۔

ہم دونوں کے تیغے ایک دوسرے کے سروں پڑے تے . . .
اس کے بعد پھر وہی اندھیرا، گہرا اندھیرا جو سر میں تپتی ہوئی سلاخ کی

مانند اترتا چلا گیا تھا۔

اور دوبارہ ہوش آنے پر شعور کی رو کی ابتدا سر میں شدید ترین تکلیف
کے احساس ہی سے ہوئی۔

میں کراہ رہا تھا . . . لیکن آنکھیں کھولنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی
. . . خداوندا . . . یہ کیسی اذیت ناک تکلیف تھی . . . ایسا محسوس ہو
رہا تھا جیسے گردن پر سر کی بجائے ناقابل برداشت درد کا پہاڑ رکھ دیا
گیا ہو۔

میری کراہیں خود میرے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں
. . . اس دوران میں نے کئی بار آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی، لیکن
کامیابی نہ ہوئی۔

دفعتاً ایک مترنم سی آواز سنائی دی۔

"کیا آپ میری آواز سن رہے ہیں؟"

"ہاں . . . آں . . . ہاں . . . آں . . . میری آنکھیں کیوں نہیں
کھل رہیں . . . کاکے طورس تو کہاں ہے؟"

"آپ کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے" اسی مترنم نسوانی آواز
نے اطلاع دی . . . "اسے کھولنے کی کوشش نہ کیجئے گا . . . اسی
طرح لیٹے رہیے"

"خداوندا . . . مجھے اس عذاب سے نجات دے"

"گھبرانے کی بات نہیں" وہی آواز پھر آئی "اب آپ خطرے

باہر ہیں۔۔۔ اللہ نے کرم کیا۔"

"تت۔۔۔تم۔۔۔کون ہو؟"

"ڈاکٹر۔۔۔آپ اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ دیجئے۔۔۔۔ کچھ بھی نہ سوچئے۔"

ڈ ڈ۔۔۔ڈاکٹر۔۔۔تو کیا۔۔۔مم۔۔۔میں اپنی دنیا میں واپس آگیا ہوں۔"

"اتنا۔۔۔بتادو۔۔۔صرف اتنا کہ اب میں کہاں ہوں؟"

سول ہسپتال میں۔۔۔میں کہہ رہی ہوں۔۔۔بالکل کچھ نہ سوچئے۔۔۔اب آپ خطرے سے باہر ہیں۔"

ٹھیک اسی وقت، میں نے اپنے داہنے بازو میں چبھن محسوس کی جیسے انجکشن دیا گیا ہو۔۔۔اور پھر۔۔۔میں دوبارہ ہر قسم کے احساس سے عاری ہوگیا۔

اس کے بعد پھر جب بھی اپنی کراہیں سنتا تو مجھے شاید انجکشن دے کر سلا دیا جاتا۔

ایسا لگتا تھا جیسے صدیاں گزر رہی ہوں لیکن سر کی تکلیف بتدریج کم ہوتی جارہی تھی۔

اسی دوران میں وہ مترنم آواز میرے ذہن میں رچ بس گئی تھی اس کے سوا اور کوئی آواز نہ سنائی دیتی۔

وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہتی، سر کی تکلیف کم ہوتے ہی میں

پھر اسی ذہنی اذیت کا شکار ہوگیا تھا، کاکے طاؤس کہاں گیا؟۔۔۔۔ طیبہ کا کیا انجام ہوا؟۔۔۔اور وہ آسامی وحشی زندہ ہے یا مرگیا۔۔۔ مجھے پوری طرح یقین ہوگیا تھا کہ میرے تیغے نے بھی اسے صحیح سلامت نہ چھوڑا ہوگا۔

"کل آپ کی آنکھوں کی پٹی کھولی جائے گی۔" مترنم آواز والی ڈاکٹر نے مجھے اطلاع دی۔

"کل۔۔۔کیا یہاں آج اور کل موجود ہیں اور اگر موجود ہیں تو پھر میں اپنی دنیا میں واپس آگیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اب آرام کیجئے۔۔۔کل ہی مزید باتیں ہوں گی لیکن سنئے۔ ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔" وہاں صرف میں تنہا عورت ہوں گی۔ میرے علاوہ دو مرد ڈاکٹر ہوں گے۔۔۔میرا مطلب ہے جہاں آپ کی آنکھوں کی پٹی کھولی جائے گی۔۔۔میں آپ کو نظر آؤں تو یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ آپ مجھے نہیں جانتے۔"

"میں بالکل نہیں سمجھا، مہربان خاتون۔"

"یہ میں پھر بتاؤں گی۔۔۔بلکہ آپ کے رویئے سے یہ ظاہر ہونا چاہیئے کہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ ہے، چچا کی لڑکی سمجھ لیجئے۔ میں نے یہاں لوگوں کو یہی بتایا ہے۔"

اس کے بعد وہ چلی گئی تھی۔ میری الجھن میں اضافہ ہوگیا۔۔۔ کیا اب کوئی نیا چکر شروع ہونے والا ہے۔۔۔الہٰی مجھے اس

شیطانی جال سے نجات دے۔

پھر وہ غالباً دوسرا ہی دن تھا، جب مجھے ایک انولیڈ چیئر پر بٹھایا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا۔

کسی نے میری آنکھوں کی پٹی کھولی۔

اس کے بعد کوئی ٹھنڈی سی چیز پپوٹوں پر لگائی گئی اور کسی قدر توقف کے ساتھ آنکھیں کھولنے کو کہا گیا۔

میں نے آنکھیں کھولیں لیکن کچھ نہ دکھائی دیا۔ چاروں طرف گھور اندھیرا تھا۔

تت . . . تو . . . کیا اب میں اپنی بصارت بھی کھو بیٹھا ہوں . . . خدایا . . . رحم . . . میرے مالک . . . کن کن جہنموں سے گزارے گا . . . میرا قصور . . . میرا قصور میرے مالک . . . میں نے ہمیشہ بڑے گناہوں سے بچنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن یہ کیا اندھیرا آہستہ آہستہ دھندلکے میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا پھر تین پرچھائیاں سی نظر آئیں اس کے بعد وہ بھی بتدریج واضح ہوتی گئیں۔

اور میں اچھل پڑا . . . وہ عورت . . . وہ تنہا عورت طیبہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ ساری میں ملبوس تھی اور ڈاکٹروں والا سفید لمبا کوٹ زیب تن تھا۔

"تت . . . تم" میں اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر ہکلایا۔

"تم دیکھ سکتے ہو" اس کے لہجے میں چہکار سی تھی۔

"ہاں میں دیکھ سکتا ہوں . . ."

"اللہ تیرا شکر ہے" کہہ کر میری طرف جھپٹی اور شانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر میری طرف دیکھنے لگی۔

"مبارک ہو ڈاکٹر" دونوں مرد ڈاکٹروں نے بیک وقت کہا۔

"شکریہ" وہ ان کی طرف مڑ کر بولی۔

دونوں باہر چلے گئے۔

وہ سیدھی کھڑی ہو گئی تھی اور ہم دونوں ساکت و ساکت ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" آخر اس نے پوچھا۔

"نجم الدین . . . !"

"کہاں رہتے ہو؟"

"دائم آباد میں"

"لیکن یہاں تو اس نام کی کوئی بستی نہیں"

"نہ ہوگی" میں نے جھلا کر کہا "وہ مردود کہاں ہے؟"

"کون . . . ؟"

"ساکے طورس"

"خدا کے لئے ہوش میں آؤ، بہتر ہے کہ خاموش ہی رہو، اگر کسی کو شبہ بھی ہو گیا کہ تم اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہو تو تمہیں مینٹل ہاسپٹل روانہ

کردیا جائے گا اور میں تمہاری دیکھ بھال نہ کرسکوں گی۔ فی الحال میں تمہیں اپنے گھر لے چل رہی ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کل میں نے تمہیں کیا ہدایات دی تھیں؟"

"تم نے کہا تھا کہ اس کمرے میں صرف تم ہی ایک عورت ہو گی اور مجھے یہ ظاہر کرنا ہو گا کہ تم میرے چچا کی لڑکی ہو۔"

"بالکل ٹھیک . . . بالکل ٹھیک۔ اس کے سوا سب کچھ بھول جاؤ۔ ذہن پر ذرہ برابر بھی زور نہ دو۔"

"اللہ ہی مجھے اس شیطانی چکر سے نکالے گا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"کچھ مت سوچو۔" میرا شانہ تھپک کر بڑے پیار سے بولی' اور میں عجیب قسم کی گھٹن میں مبتلا ہو گیا۔

اس کے بعد میں نے خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ کیونکہ اب میرے ہاتھوں میں اوسیرس کی انگشتری بھی نہیں تھی۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر میں ہسپتال سے "بنت عم" کے بنگلے میں منتقل ہو گیا۔

ہزاروں سال کا فاصلہ طے کر کے میں ایک بار پھر اپنی دنیا میں واپس آ گیا۔

طیبہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ ایک پل کے لئے بھی نہ وہ میرے چہرے سے نظر ہٹانا چاہتی تھی اور نہ میں اس کے چہرے سے۔

اس کا چھوٹا سا بنگلہ بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔

"اب تم مجھے ایک بات بتاؤ۔" بالآخر میں نے کہا۔

"پوچھو! کیا پوچھنا چاہتے ہو' آج میں بہت خوش ہوں۔"

"تم دیوی ہو یا ہیکل کی مقدس کنواری؟"

"میں نہیں سمجھی۔"

"آتیسس سے مشابہ ہو۔ لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ تم اس کے ہیکل کی کنواری ہو۔"

"اوہو . . . مصری صنمیات سے بھی دلچسپی ہے تمہیں۔ تم نے ٹھیک کہا! میں آتیسس کے بت سے مشابہ ہوں۔"

"خدا کے لئے مجھے اس جنجال سے نکالو۔"

"کس جنجال سے؟"

"ابوالفرحان اور کاکے طورس کے جنجال سے۔"

"یہ دونوں نام میرے لئے بالکل نئے ہیں۔"

کاکے طورس آتیسس کا بڑا پجاری اور ابوالفرحان سیٹ یا ٹائفن نیا جنم ہے۔"

"اوہو . . . تو مصری اساطیر کے مطالعے نے تمہیں کسی قدر ذہنی اختلال میں مبتلا کر دیا ہے' لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے . . . اگر آتیسس کے بت نے تمہارے ذہن قبضہ جما رکھا تھا تو مجھے کیا ہو گیا تھا۔"

"تت . . . تمہیں۔"

"ہاں . . . آؤ . . . میرے ساتھ . . . میں تمہیں بتاؤں کہ تم میرے

لئے اجنبی نہیں ہو۔"

میں اس کے ساتھ ایک ایسے دروازے پر آرکا جو مقفل تھا قفل کھول کر اس نے کواڑوں کو دھکا دیا اور ہم ایک کمرے میں داخل ہوتے۔ یہ کسی مصوّر کا نگار خانہ معلوم ہوتا تھا۔

میں حیران رہ گیا تھا، چاروں طرف میری ہی تصاویر نظر آرہی تھیں، حتیٰ کہ عورتوں کی تصاویر میں بھی میرے ہی خدوخال موجود تھے۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ میری ہابی ہے۔ دس سال سے صرف یہی ایک چہرہ پینٹ کر رہی ہوں!... انتہائی کوششوں کے باوجود بھی کوئی دوسری شکل نہیں بنا سکی۔ اب بتاؤ... کیا تم میرے لئے اجنبی ہو... بہت بڑے دکھ جھیلے ہیں اس کی وجہ سے میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی..."

"سششش شوہر۔"

"ہاں... وہ ایک ماہر نفسیات اور وہمی آدمی تھا... محض اسی چہرے نے اس کی زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا۔ وہ میرے لاشعور میں بھی کسی دوسرے کی پرچھائیاں دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔"

"کیا تم اسے نہیں چاہتی تھیں...؟"

"وہ میرا محبوب تھا۔"

"پھر یہ چہرہ۔"

"یہ چہرہ... میرے خدا میں کچھ بھی تو نہیں جانتی اس کے متعلق!"

وہ بے بسی سے اپنی پیشانی مسلنے لگی۔ پھر بولی۔ "یہ چہرہ عجیب سی خلش بنا رہا ہے میرے لئے۔ یقین کرو، میں اسے خوابوں میں بھی دیکھتی رہی ہوں۔"

"اور تم نے مجھے صدیوں اور قرنوں کے گرداب میں پھنسا رکھا ہے۔"

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"پہلے تم مجھے یہ یقین دلاؤ کہ میں ۱۹۷۵ء میں ہی سانس لے رہا ہوں۔"

"وہ سامنے کیلنڈر دیوار پر موجود ہے۔"

"اوہاں... لیکن کہیں یہ بھی فریب نہ ہو۔"

"آخر تمہارے ذہن میں کیا ہے مجھے تفصیل سے بتانے کی کوشش کرو۔" اس نے کہا۔

میں نے اپنی کہانی کی شروعات ابوالفرحان سے کی... وہ بڑے غور سے سنتی رہی... اور جب میں سانپوں کی وادی سے طیبہ تک پہنچا تو وہ بے ساختہ اچھل پڑی۔

"کیا کہا تم نے... کیا نام لیا؟"

"طیبہ...!"

پھر کہانی کا بقیہ حصہ جہاں تہاں رہ گیا، کیونکہ میں نے اس کے چہرے پر کرب کے آثار دیکھے تھے پورا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا۔

"طیبہ..." وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ "مجھے کون کہتا تھا طیبہ... خدایا کوئی کہتا تو تھا... طیبہ... طیبہ۔"

اب وہ خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی تھی اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولی "میرا نام طیبّہ ہے . . . طیبّہ سجّاد . . . میرے والد کا نام سجّاد علی تھا . . . کوئی تو کہتا تھا طیّبہ . . . کون کہتا تھا . . . کون تھا . . . وہ"

کچھ دیر وہ خیالات میں کھوئی رہی پھر بولی۔ اچھّا چلو مجھے وہ مکان دکھاؤ، جہاں ابوالفرحان رہتا تھا"

"مکان . . . تم تو کہتی ہو یہاں دائم آباد نام کی کوئی بستی نہیں ہے"

وہ پھر مجھے غور سے دیکھنے لگی اور یک بیک چونک کر بولی۔

تم نے اس حادثے کا تو ذکر ہی نہیں کیا جس کے نتیجے میں تم ہسپتال تک پہنچے تھے"

"میری کہانی ختم کہاں ہوئی ہے۔ تم بیچ ہی سے لے اڑی تھیں۔ لیکن طیّہ اور طیّبہ بڑی عجیب بات ہے، ہاں تو پھر جب دوسری بار مجھے ہوش آیا تو میں آسامی وحشیوں کی قید میں تھا۔ طیّہ کے باپ سے معلوم ہوا کہ طیّہ یعنی تم وحشیوں کی قید میں ہو!" میں داستان کو آگے بڑھاتا رہا اور وہ اسٹول پر بیٹھی مجھے ایک ٹک تکتی رہی! اور پھر جیسے ہی وحشی سردار کا تیغہ میرے سر پہ پڑا..." وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے" میں جھنجھلا گیا۔

بڑی مشکل سے اس کی ہنسی رُکی اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مجھے معاف کر دو۔ تمہاری کہانی درست ہو گی، لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ پچیس دن پہلے تم ایک بس کے نیچے آ کر

زخمی ہو گئے تھے تمہارا سر پھٹ گیا تھا، پورے بیس دن بے ہوش رہنے کے بعد کسی قدر ہوش میں آئے تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ یا تو تم اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہو یا تمہاری قوت بینائی ضائع ہو گئی ہو گی . . . پہلا خیال درست نکلا . . . تم اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہو"

اس بار میں نے قہقہہ لگایا۔ وہ بولی آہستہ آہستہ زور سے نہ ہنسو . . . کہیں زخم کے ٹانکے نہ ٹوٹ جائیں"

بس کے نیچے آ گیا تھا . . . میں نے ذہن پہ زور دیا۔ بس . . . دندناتی ہوئی دیو پیکر بس جس کے پیچھے اسکوٹر اور کار کی ناجائز اولاد موٹر رکشائیں دوڑ رہی تھیں، میرا سر چکرا گیا . . . وہ تاریکی . . . !

میں اندھیرے اجالے کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر اجالا ہوا تو بستر پر لمبا لمبا لیٹا ہوا تھا، اور وہ میرے قریب بیٹھی پر تشویش نظروں سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔

"تت . . . تم ٹھیک ہو نا!" وہ ہکلائی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو . . . لیٹے رہو . . . کچھ بھی نہ سوچو"

لیکن میں سوچتا رہا . . . یقیناً مجھے حادثہ پیش آیا تھا . . . اس وقت جب میں ایک سڑک پار کر رہا تھا، میں سمجھا تھا کہ بس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی میں سڑک پار کر جاؤں گا، لیکن بس کی دوسری طرف سے ایک تیز رفتار موٹر رکشا نے نکل کر مجھے گڑبڑا دیا . . . .

موٹر رکشا بس کی اوٹ میں تھی مجھے نہیں دکھائی دی تھی۔ بہرحال اب میرا چہرہ پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ ذہن کی عجیب سی کیفیت تھی اور اگر یہ یادداشت کھو بیٹھنے والا کیس تھا تو طیبہ کو بھی میرے لئے اجنبی ہی ہونا چاہئے تھا، اس بے ہوشی سے پہلے کی ایک ایک بات یاد تھی . . . ٹھیک ہی تو ہے . . . یہاں دائم آباد کہاں وہ تو جلال آباد کا ایک محلہ ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ میں نصیر آباد گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لئے آیا تھا . . . اور کارواں ہوٹل میں میرا قیام تھا . . . یہاں کسی سے جان پہچان بھی نہیں تھی اپنی افتادِ طبع کی بنا پر گھر والوں سے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ قیام کہاں ہوگا۔ میں گرمی کی چھٹیوں میں ہمیشہ کسی ایسی جگہ کا رخ کرتا تھا جہاں میرا ایک بھی شناسا نہ ہو . . . لیکن پچیس دن . . . کا یہ مطلب ہوا کہ پورے ایک ماہ سے گھر والوں کو میرے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہوسکا ہوگا۔ نصیر آباد پہنچنے کے ٹھیک پانچ دن بعد یہ حادثہ پیش آیا تھا . . . ویسے میں ایسی جگہوں پر قیام کے دوران میں تیسرے چوتھے دن خط ضرور لکھ دیا کرتا تھا۔

میں نے طیبہ کی طرف دیکھ کر کہا " تم ٹھیک کہتی ہو۔ نصیر آباد میں دائم آباد کہاں وہ تو جلال آباد میں ہے "

" جلال آباد . . . جلال آباد " وہ مضطربانہ بڑبڑائی اور اُٹھ کر ٹہلنے لگی، پھر رک کر میری طرف مڑی۔

" تو تمہیں یاد آگیا کہ تم بس کے نیچے آگئے تھے "

" ہاں، بالکل یاد آگیا، اور یہ بے ہوشی کے پچیس دن مجھے ایک بھیانک خواب دکھاتے رہے ہیں . . . جو اس وقت بھی مجھے پوری تفصیل کے ساتھ یاد ہے "

" اوہ . . . وہ مکان . . . اور وہ دونوں نام . . . کیا نام تھے ؟ "

" ابوالفرحان اور کاکے طورس " میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا " یہ دونوں قطعی بجا اس ہیں، وہ عمارت تو تین سال سے خالی پڑی ہے . . . وہاں ایک قتل ہوگیا تھا، اس کے بعد سے کسی نے بھی اسے کرائے پر نہیں لیا، مالک مکان کسی دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔

" اگر یہ خواب تھا تو اس کی مثال انسانی ذہن کی پوری تاریخ میں نہ مل سکے گی !" طیبہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا " خیر اب تم سب کچھ بھول جاؤ، اپنے ذہن پر بالکل زور نہ ڈالو "

پھر وہ رات خاموشی سے گذر گئی تھی۔ ڈاکٹر طیبہ نے دوسرے دن بتایا کہ وہ رات بھر نہیں ہوسکی۔

" اے میری بنتِ عم . . . میری وجہ سے تم نے بڑے دکھ جھیلے ہیں اور میں اس سے لاعلم رہا، آخر تم کون ہو اور مجھے بتاؤ کہ میں کون ہوں "

ہم دونوں آج شام کی گاڑی سے جلال آباد چلیں گے۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا " میں تمہارے گھر چلنا چاہتی ہوں "

" طیبہ۔ ۔ ۔ کیا تم یہاں تنہا رہتی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ تمہارا کوئی عزیز ساتھ نہیں ہے۔

" نہیں کوئی بھی نہیں! طلاق کے بعد سے میرے سارے اعزا نے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ ۔ ۔ دو بوڑھے ملازمین کے سوا میرے ساتھ اور کوئی نہیں ہے اور اگر وہ بھی نہ ہوتے تو تمہیں اسٹوڈیو سے اٹھا کر یہاں کون لاتا۔ میرے بس کے تو تھے نہیں۔ ۔ ۔ "

" تم بڑی اچھی مصور ہو "

" کہیں باقاعدہ طور پر مصوری نہ سیکھی، بس خبط ہے "

" تم جلال آباد کیوں جانا چاہتی ہو؟ "

" آٹھ سال کی عمر تک میں وہیں رہی تھی اور تمہیں حیرت ہوگی، کہ دائم آباد میں ہی قیام تھا "

" بس کرو " میں ہاتھ اٹھا کر بولا " ذہنی طور پر بہت تھک گیا ہوں، اب کچھ نہیں سوچنا چاہتا "

ڈاکٹر طیبہ بہت زیادہ متفکر نظر آ رہی تھی، دوپہر کے کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے خاندان والوں کی تصویروں کا البم دکھانے لگی۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن پھر بھی خصوصی توجہ کی اداکاری کرتا رہا کہ اچانک ایک تصویر دیکھ کر چونک پڑا۔ یہ

سو فیصد ابو الفرحان تھا۔ ۔ ۔

" یہ۔ ۔ ۔ یہ۔ ۔ ۔ کون صاحب ہیں " میں نے اس سے پوچھا۔

" میرے چچا ہیں بہت پرانی تصویر ہے "

" ابو الفرحان "

" کیا مطلب "

" ان صاحب۔ ۔ ۔ اور ابو الفرحان میں سرمو فرق نہیں! "

" خدایا یہ سب کیا ہے " وہ البم بند کر کے مجھے گھورنے لگی۔

یہ ٹھیک ہے کہ میں مصری اساطیر کا گہرا مطالعہ کرتا رہا تھا اور اسی سلسلے میں آئیسس کے بت کی تصاویر بھی میری نظروں سے گزری ہوں گی۔ ۔ ۔ وہ یقیناً تم سے مشابہہ تھی، لیکن تم اپنی اس ذہنی کیفیت کو کس خانے میں فٹ کرو گی جس کے تحت میرا چہرہ پینٹ کرتی رہی ہو "

اس نے میرے اس ریمارک کا کوئی جواب نہ دیا، ویران آنکھوں سے خلا میں گھورے جا رہی تھی۔

پھر میں نے اس کی سرگوشی سنی۔

" مجھے طیب، کون کہتا تھا؟ "

" چھوڑو بھی اسے بنتِ عم۔ ۔ ۔ اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ یہاں کچھ واقعات بے سبب بھی ہو جاتے ہیں! " میں نے کہا۔

لیکن اس نے توجہ نہ دی۔ ۔ ۔ اسی طرح بار بار دہراتی رہی۔

"مجھے طیبہ کون کہتا تھا!" میں کچھ نہ بولا۔

"تم کون ہو" وہ میری طرف مڑی، آنکھوں میں اب بھی حیرانی تھی۔

دفعتاً میں غیر ارادی طور پر سوال کر بیٹھا "تم ۔ ۔ ۔ دائم آباد میں کہاں رہتی تھیں"۔

"پھر ایسا لگا جیسے وہ چونک کر آپے میں آگئی ہو"

"مجھے یاد آگیا ۔ ۔ ۔ مجھے یاد آگیا" وہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ "وہی مجھے طیبہ کہتا تھا ۔ ۔ ۔ وہی بچہ ۔ ۔ ۔ کوئی بچہ تھا ۔ ۔ ۔ تم مجھے جلال آباد لے چلو ۔ ۔ ۔ میں وہاں دائم آباد میں وہ مکان تلاش کر لوں گی جہاں میں رہتی تھی"

شام کی ٹرین سے ہم جلال آباد روانہ ہوئے ۔ ۔ ۔ وہ خاموش تھی ۔ ۔ ۔ میں نے کئی بار اسے گفتگو کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہوں ہاں کرکے ٹال گئی۔

دوسری صبح جلال آباد پہنچے تھے، وہ ریلوے اسٹیشن سے دائم آباد تک ٹیکسی کے سفر میں جگہ جگہ اپنی یادداشت تازہ کرتی رہی۔

پھر جیسے ہی ٹیکسی میرے مکان کے سامنے رکی، اس نے بائیں جانب والی عمارت کو دیکھ کر کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "او خدایا، اسی عمارت میں تو ہم لوگ رہتے تھے۔ اوہ تو کیا سچ مچ وہ تم ہی تھے۔ مجھے تین سال کا وہ بچہ یاد آرہا ہے، جو مجھ سے بہت مانوس تھا ۔ ۔ ۔ کیا نام تھا ۔ ۔ ۔ مجھے نام یاد نہیں آرہا"

میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی، میرے ساتھ کسی خاتون کو دیکھ کر باہر سے اندر تک عجیب سی سنسنی پھیل گئی

طیبہ اندر چلی گئی اور خاندان کے مرد مجھے اندر بیٹھک میں گھیر بیٹھے میرے سر پر اب بھی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور چہرہ بھی ستا ہوا تھا۔ میں نے گھر والوں کو صرف اتنا ہی بتایا کہ میں ایک حادثے کا شکار ہوکر پچیس دن تک ہسپتال میں بے ہوش پڑا رہا تھا اور اسی لیڈی ڈاکٹر نے میری خصوصی نگہداشت کی تھی۔

میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ طیبہ سے کئی گھنٹے تک ملاقات نہ ہوسکی۔ شام کو ڈریسنگ کے بہانے وہ بیٹھک میں آئی تھی لیکن اس کے ساتھ خاندان کی دو خواتین بھی تھیں۔

اس وقت میں نے اس کے چہرے پر بحالی دیکھی، دونوں خواتین کی موجودگی میں ہم اپنی الجھنوں کے بارے میں سوالات نہیں کر سکتے تھے۔

ڈریسنگ کے بعد وہ خاموشی سے تہہ کیا ہوا کاغذ میرے ہاتھ میں پکڑا گئی تھی۔

تنہائی نصیب ہوتے ہی میں نے وہ کاغذ نکالا۔ طیبہ نے لکھا تھا۔

"نجمو!"

"وہ تم ہی تھے۔ میں تمہیں نجمو ہی کہتی تھی۔ امی اور خالہ جان نے اس

کی تصدیق کر دی ہے۔ تم تین سال کے تھے اور میری عمر آٹھ سال تھی، جب میرے ابو جان کا تبادلہ یہاں سے ہو گیا تھا۔

تم ہی مجھے طیبہ کہتے تھے، میں تمہیں بے حد چاہتی تھی اور تم بھی میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

اب مجھے یاد آیا کہ میرے جن چچا کو تم نے ابوالفریان کی حیثیت سے پہچانا تھا، وہ تمہیں بہت پریشان کرتے تھے اور تمہیں ان سے شدید نفرت تھی، کتنی عجیب بات ہے کہ ہم دونوں پر یکساں ذہنی واردات گزریں، تمہارا ذہن آہیس کے بت کے سہارے ڈھکی چھپی محبت کو پروان چڑھاتا رہا اور میرے ذہن نے رنگ اور برش کا سہارا لیا۔ ۔ ۔ دونوں کی منزل غیر شعوری طور ایک ہی تھی، اب میری سمجھ میں یہاں آیا کہ کیا ہوگا۔ فی الحال تمہارے کمر دالوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے، اس میں کچھ تو پرانی شناسائی کو دخل ہے اور زیادہ تر اظہار ممنونیت شامل ہے کہ میں نے تمہاری نگہداشت کی تھی۔

خط ختم کر کے میں دم بخود رہ گیا۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے؟ کیا بیس دن کی طویل بے ہوشی کے عالم میں نظر آنے والے خواب بالتفصیل یاد رہ سکتے ہیں، جب کہ ہوش میں آنے کے بعد دن چار بھی یاد نہ آ سکے، جس کی بنا پر بے ہوشی طاری

ہوئی تھی۔ یہ کیسی خود فراموشی تھی!

یہ درست ہے کہ خواب کا مواد مصری صنمیات کے مطالعے نے فراہم کیا تھا اور طیبہ کی شخصیت لاشعور سے ابھری تھی۔ لیکن وہ بیہوشی تھی، نیند تو نہیں تھی، جس میں شعور نیم بیدار ہوتا ہے اور شعور کی یہی نیم کیفیت بحالت بیداری خوابوں کو یاد دلانے میں مددد معاون ثابت ہوتی ہے۔ آخر طویل بیہوشی کے ساتھ بھی یہ خواب بالتفصیل کیونکر یاد رہ سکا۔ ۔ ۔؟ کیا طیبہ سچ مچ کوئی ماورائی الفطرت ہستی ہے جس کے وسیلے سے یہ ناممکن ۔۔۔ ممکن بن سکا۔!

وہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اب کیا ہوگا۔ ۔ ۔؟ کیا اب میں اس کی جدائی برداشت کر سکوں گا؟

دوسری صبح وہ پھر آئی لیکن تنہا نہیں تھی! گھر کی ایک بزرگ

خاتون بھی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ خاموشی سے میرے سر کی پٹیاں بدلتی رہی۔ اس کے چہرے پر گہری فکرمندی کے آثار تھے اور ہاتھوں میں لرزش تھی! میں سوچ رہا تھا کہ ابھی ایک پیشہ ور ڈاکٹر کی طرح میرے سر کے زخم سے متعلق کوئی تشفی آمیز بات کہے گی . . . لیکن وہ کچھ بھی تو نہ بولی۔ البتہ اس کی تیز تیز سانسیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

چلتے وقت بزرگ خاتون کی نظر بچا کر اس نے ایک تہہ کیا ہوا پرچہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

اس بار اس نے لکھا تھا :

"نجمو . . .

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا ہوگا . . . تم میرے لئے اجنبی نہیں ہو! نہ میں تمہارے لئے اجنبی۔ ہمارے ذہن نادانستہ طور پر ایک دوسرے سے قریب آ رہے ہیں، لیکن میں یہ سب کچھ کیوں لکھ رہی ہوں تمہارے گھر کا ماحول ایسا ہے کہ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہونے لگتا ہے! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اور کیا لکھوں؟ کیوں لکھوں؟ میں کیا چاہتی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا . . . تم کیا سوچ رہے ہو؟ خدا جانے؟ . . .

اور میں سوچ رہا تھا کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ کس طرح ممکن ہوگا! لیکن دوسری صورت میں شاید میں زندہ بھی نہ رہ سکوں!! اس سے جدائی کے تصور ہی سے دم گھٹنے لگتا تھا۔!

دوسرے دن اُسے نصیر آباد واپس جانا پڑا تھا . . . میں کیا

کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ الجھن اس قدر بڑھی کہ ایک بار پھر مجھ پر غشی کا . . . دورہ پڑ گیا! پھر دوبارہ ہوش آنے پر احساس ہوا کہ میں اپنے گھر میں نہیں ہوں۔ عجیب سی سفیدی میرے گرد پھیلی ہوئی تھی اور ایک خاص قسم کی خوشگوار بو فضا میں رچی بسی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے بستر سے اٹھنا چاہا لیکن ایک مانوس سی آواز آئی۔

"لیٹے رہو . . . !

آواز طیبہ کی تھی، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دائیں بائیں دیکھنے لگا . . . لیکن آواز سرہانے سے آئی تھی۔

پھر وہ سامنے آ گئی۔ ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ میں کسی سحر زدہ کی طرح پلکیں جھپکائے . . . اُسے دیکھتا رہا۔

"تم بہت ذہین ہو!" وہ مجھ پر جھک کر آہستہ سے بولی "مجھے نصیر آباد جانے سے روکنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی تھی!"

میں تھوک نگل کر رہ گیا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ میں نے اُسے روکنے کے لئے بیہوشی کی اداکاری کی تھی۔

"لل۔ لیکن میں کہاں ہوں!" میں نے نحیف سی آواز میں پوچھا۔

"سول ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں!"

"اوہو!" میں متحیّر رہ گیا! اور پھر خوشی بھی ہوئی کہ میرے خاندان کی قدامت پسند خواتین کی رسائی یہاں تک نہ ہو سکے گی!

"میں نے تمہاری تیمارداری اپنے ذمے لی ہے۔"

"بب... بہت اچھا ہوا... میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے علاوہ اور کیا کہوں۔ لیکن شاید وہ میری زبان سے اور کچھ سننا چاہتی تھی۔"

چاروں طرف دیکھ کر بولی۔ اس وقت یہاں میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔"

میں پھر تھوک نگل کر رہ گیا!

"مجھے یقین ہے کہ اس سلسلے میں تمہارے بھی وہی جذبات ہوں گے جو میرے ہیں۔" میں نے اعتراف میں سر کو جنبش دی۔

"کچھ منہ سے بھی بولو بجو... ایسا تاثر نہ دو کہ میں تمہارے سر پر زبردستی مسلّط ہو رہی ہوں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں طیبہ!" میں بھرّائی آواز میں بولا۔

"تو پھر بتاؤ کہ تم کیا جانتے ہو!"

"مم... میں تم سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا!"

"مجھے یقین تھا... مجھے یقین تھا...!" وہ خوش ہو کر بولی۔ "میں نے آج ہی مزید ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست روانہ کر دی ہے۔"

"لیکن ایک ہفتے کے بعد کیا ہوگا۔"

یک بیک وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر کرب کے

آثار تھے! اور آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں تیرنے لگی تھیں!

"میں سمجھتی ہوں!" کچھ دیر بعد وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تمہاری ایک منگیتر بھی پہلے سے موجود ہے ـــ میں ایک مطلقہ ہوں...!"

"منگیتروں کے کھیت والدین اگاتے ہیں! مجھے اس سے کیا سروکار... میں نہیں جانتا ہوں۔ وہ کون ہے۔"

"کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"میں نے تو اسے آج تک دیکھا بھی نہیں!"

"پھر تم کیا کہنا چاہتے تھے ـــ!"

"اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا! مجھے بتاؤ کہ ایک ہفتے کے بعد کیا ہوگا!"

"خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا ہوگا!"

"اب یہ لوگ مجھے تنہا سفر نہیں کرنے دیں گے!" میں کراہا۔

"میں سمجھتی ہوں!"

"پھر کیا صورت ہوگی...!" میں نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

"وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر بولی! فی الحال اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دو۔ اس پر ذرا بھی بار نہ ڈالو۔!"

میں کچھ نہ بولا۔ آنکھیں بند کر لیں... وہ بستر کے قریب ہی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی...!

تھوڑی دیر بعد بولی! "کیا تمہیں نیند آ رہی ہے!"

"نہیں !" میں نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیا سچ مچ تم بیہوش ہو گئے تھے !"

"میرا خیال ہے کہ وہ اداکاری نہیں تھی ! اُلجھنوں نے ایک بار پھر مجھے ذہنی طور پر تاریکیوں میں دھکیل دیا تھا۔"

"مت سوچو ! کچھ مت سوچو۔ نصیر آباد میں میرا کوئی نہیں ہے۔ سارے قریبی سے تعلقات خراب ہو چکے ہیں اب میں کوشش کروں گی کہ اپنا تبادلہ یہیں کرا لوں !"

"اوہ۔۔۔ !"

"فی الحال اس سے بہتر اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔۔۔ !"

"اب میں اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ سکتا ہوں !" میں نے آہستہ سے کہا اور طیبہ کی آنکھیں جگمگا اُٹھیں۔۔۔ !

ختم شد